نوکِ نشتر

کنھیّا لال کپور

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ ممبئی

بار اوّل جون سنہ ۱۹۴۹ء

قیمت ۲ روپے ۸ آنے

بیجناتھ نیّر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے
چھپواکر نوہند پبلشرز لمیٹڈ ۳۰۱ عبدالرحمٰن اسٹریٹ بمبئی ۳ سے شایع کیا

مولانا صلاح الدین احمد ــــــــ

ادیب - ادب نواز - ادیب ساز ــــــ

کے نام ــــــ

فہرس

پیش لفظ

'سنگ و خشت'، 'شیشہ و تیشہ' کی مناسبت سے اس کتاب کا نام "گوشت و خون" ہونا چاہیئے تھا۔ اور اگر اس کے سر ورق پر "ہندو مسلم فساد" کی تصویر ہوتی اور اس کے نیچے مجازؔ لکھنوی کا مصرع

"تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ"

تو بلا شبہہ کتاب خاص حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ لیکن اس نام میں یہ قباحت تھی کہ اگر سر ورق دیکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی رگِ حمیت ایک بار پھر پھڑک اٹھتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں تباہ ہو جاتے۔ اس لئے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس کا نام "نوکِ نشتر" رکھا جائے۔ یہ نام میں نے اختراع نہیں کیا۔ اس لئے اگر آپ کو پسند نہ آئے تو میرے دوست جناب عاشق حسین بٹالوی کو کوسیئے گا۔ کہ انھوں نے یہ نام میری سب سے پہلی تصنیف کے لئے (آج سے کوئی چھ برس پہلے) تجویز کیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد صاحب اس بات کے گواہ ہیں اور ان کا پتہ وہی ہے جو تقسیم ہندوستان سے پہلے تھا۔

میں نے یہ کتاب تین سال کے بعد لکھی ہے۔ امید ہے اس عرصے میں قارئین نے میری پہلی تینوں کتابیں پڑھ لی ہونگی۔
میں کتاب لمبے وقفے کے بعد اس لئے لکھتا ہوں کہ قارئین کو پڑھنے کے لئے کافی وقت مل جائے۔ اس سے اگلی کتاب چھ سال کے بعد لکھنے کا ارادہ ہے۔ بشرطیکہ آپ زندہ رہے اور میرا دماغی توازن قائم رہا۔
اچھا اب اجازت دیجئے۔

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

کنھیّا لال کپور

برج بانو

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ آج کل کہاں ہے؟ اس کے عجیب وغریب نام کی وجہ کیا ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کئے جا سکتے ہیں، شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دیئے جا سکیں۔ تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرا دوں برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان آئی ہے۔ کیا میں اُسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوبصورت عورت تو کجا کسی بدصورت پنواڑن کو بھی اغوا کرنا گناہِ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ اگر آپ یہ پوچھتے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو میں یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا۔ وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر میں

رہ رہی ہے۔ اسے برج بانو کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔ آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہرکیف وجہ بیان کئے دیتا ہوں۔ اسے برج بانو کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ آپ کو یقین نہیں آتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنی پڑے گی جو ایک باریش بزرگ ہے۔ جسے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں اور جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ عورت لوگوں سے عشق کرتی ہے؟ آپ نے غلط سمجھا۔ یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی۔ لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ ایسی موہنی اور کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل و جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے۔ میری عمر تیس برس کی تھی، جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھبیس سال ہے عشق کرنے کے لئے نہایت غیر موزوں ہے۔ لیکن میں مجبور تھا اور مجھ پر ہی کیا منحصر ہے۔ لکھنؤ میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار ہوا کرتا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر کچھ ایسا مرمٹا کہ ساری عمر اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی جس کا ہر مصرع پانچسو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ہمراہ آئی ہے۔ لیکن چند

دنوں سے اداس سی رہتی ہے، وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ پچھلے دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے ایک لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسایے ہیں، مجھ سے کہنے لگے "لالہ جی کیا مذاک ہے۔ آپ کے گھر ایک ایسی عورت رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا" اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بار بار کہہ چکے ہیں "آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سرحد پار کرنے سے پہلے آپ اسے ستلج کی لہروں کی نذر کر دیتے۔"

میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں تو مجھے سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گزرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بیچاری ہر روز جلی کٹی سن سن کر تنگ آگئی ہے۔ آج دوپہر کے وقت جب وہ ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا "برج بانو! میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمھیں رہنے نہیں دیں گے۔"

"لیکن کیوں؟" برج بانو نے چونک کر کہا "میرا قصور؟"

"تمھارا قصور یہ ہے کہ تمھارا باپ مسلمان تھا۔"

"لیکن میری ماں تو ہندو تھی۔"

"ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

"یہ عجیب منطق ہے"

"یہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں، وہاں منطق کی دال نہیں گلتی۔"

وہ اور بھی اداس ہو گئی۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "برج بانو

تمھیں اب یہاں سے آوشیہ چلے جانا ہوگا۔"

ایک لمحے کے لئے وہ میرے منھ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو اور پھر کہنے لگی۔

"اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟"

"شہر کا نام نہیں۔ آوشیہ ہندی زبان میں ضرور کو کہتے ہیں۔"

وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی۔" میری پرنانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھی۔"

میں نے پوچھا "تم ضرور کو آوشیہ کیوں نہیں کہتیں؟"

برج بانو نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔" کہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔"

" بس اسی لئے تمھیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔"

یک لخت برج بانو کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا " ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟"

" تمھارا گھر پاکستان ہے"

" یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دِلّی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دہلی میں بسر ہوا۔ مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منھ لگایا، دیوانِ عام میں مجھے سب سے اونچی

مسند پر بٹھایا گیا۔ اور جس وقت میرا ستارہ عروج پر تھا کوئی بنگالی، گجراتی سندھی حسینہ میرے حسن، میری بھڑک اور مٹکنے کی تاب نہ لاسکی۔ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی۔"

"یہ درست ہے پرنتو ...."

"یہ پرنتو کیا بلا ہوتی ہے جی؟" برج بانو نے شرارت سے کہا۔

"پرنتو ہندی میں لیکن کو کہتے ہیں۔"

"ہاں یاد آیا میری نانی بھی لیکن کو پرنتو کہا کرتی تھی۔"

"تمھیں بھی اب لیکن کو پرنتو کہنا ہوگا۔"

"معاف کیجیے۔ میں تو لیکن کو لیکن ہی کہوں گی۔"

"یہی تو تمھاری غلطی ہے۔ اگر لیکن کو پرنتو نہیں کہوگی تو تمھیں یہاں سمجھے گا کون؟"

ہر وہ شخص ....

معاً ایک قلفی بیچنے والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا۔ برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کیے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو بلاتی ہے۔

"قلفی کھائیں گے آپ؟" وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔

"کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے۔ میں تم سے نہایت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمھیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟"

"پہلے قلفی کھا لیجیے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے

پر غور کریں گے۔" اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے
"کیسی ہے یہ قلفی تمھاری۔ میرا مطلب ہے کچھ ٹھکانے کی ہے یا یوں ہی سی؟"
قلفی والا کن انکھیوں سے برج بانو کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے "اجی کیا پوچھتی ہیں آپ۔ میری قلفی؟ میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار"
برج بانو کے معصوم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔ قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اُسے بیٹھنے کے لئے کہتا ہوں لیکن وہ بدستور کھڑی ہے۔ اور مسکرا رہی ہے۔
"کیا فیصلہ کیا تم نے پاکستان جا رہی ہو نا؟"
وہ میری بات ان سنی کر کے ایک سکھ ڈرائیور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے، "وہ دیکھیے۔"
میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چند اشعار اُردو میں لکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔"

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ "چنا زور گرم" بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ
اس میں ڈالا مرچ مصالحہ
چنا لایا میں بابو مزیدار
چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برج بانو ایک اردو روزنامہ خریدتی ہے۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہے، اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہے:۔

"برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی"

ایک لحظہ کے لئے اس پر گویا بجلی سی گرتی ہے۔ وہ دھم سے گرا چاہتی ہے۔ لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔

دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں" ضد نہ کرو بانو تمھیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔"

وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے۔ "میں نہیں جاونگی ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ...."

"حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلفی والے، سکھ ڈرائیور

اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔"

"خدا کی قسم بڑی ضدی ہو تم۔"

برج بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں "لاجواب! شاندار!! بے نظیر!!!"

سخن فہم!

جالندھر کے دو ستم ظریفوں کو مذاق سوجھا۔ انھوں نے میرا نام ایک مشاعرے کی صدارت کے لئے تجویز کر دیا۔ ستم یہ کہ مجھے اس حادثے کی اطلاع اس وقت دی جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ یعنی مشاعرے کا اعلان اخبارات میں کر دیا گیا تھا۔ دعوتی رقعہ کا مضمون جو سکریٹری مجلسِ وہشت پسند شاعراں" کی طرف سے تھا حسبِ ذیل تھا۔

"محترمی!

چونکہ تقسیم ہندوستان کے بعد مشاعروں کے مستقل صدر مولینا سنجیب آبادی ہم سے چھن گئے ہیں اس لئے مجبوراً آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔ مشاعرے کی صدارت فرماکر خاکسار کو ممنون فرمائیں۔ اُمید ہے کہ آپ اس جسارت کے لئے معاف فرمائیں گے نیاز مند "سکریٹری"

حبارت کا لفظ مجھے ذرا کھٹکا ۔ اگر اس کی بجائے "خباثت" ہوتا تو شاید میں سکریٹری صاحب کو معاف کر دیتا لیکن حبارت !! مشاعرے کا اشتہار پڑھا تو ہکا بکا رہ گیا ۔ تین چار اچھے شاعروں کے علاوہ کوئی بھی ایسا نام نظر نہ آیا جو اس سے پہلے کہیں پڑھا یا سنا تھا ۔ ایک صاحب قاتل مرگھونڈی تھے ۔ تخلص تو خیر خوب تھا ۔ آخر انسان ایک دہشت پسند شاعر سے اور کیا توقع کر سکتا ہے ۔ لیکن مرگھونڈ ؟ خدا جانے یہ شہر کون سے دشت میں آباد ہے ؟ اٹلس منگوائی کافی وقت اس شہر کو تلاش کرنے میں صرف کیا لیکن بے سود ۔ ایک اور شاعر تفنگ پٹنوی تھے ۔ خدا کا شکر کیا کہ آخر پٹنے نے بھی ایک شاعر تو پیدا کیا چاہے وہ تفنگ کی قبیل سے تھا

میں مشاعروں اور مجالس کی صدارت سے ذرا نہیں بلکہ کافی گھبراتا ہوں ۔ بے تکلف احباب کی محفل اور چیز ہے لیکن کرسی صدارت پر بیٹھ کر کوئی کام کی بات کرنا میرے بس کا روگ نہیں ۔ اکثر واہی تباہی بکنے لگتا ہوں ۔ یا پھر خود کو یا کسی اور کو سنانا شروع کر دیتا ہوں اس لئے صدارت کی جاں گداز خبر پڑھ کر جو اثر میرے اعصاب پر ہوا وہ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔ کہاں مولانا نجیب آبادی اور کہاں یہ نیم جاں ۔ اگر دنیا میں کوئی شخص جسمانی اور ذہنی طور پر مولانا کی ضد ہو سکتا ہے تو وہ خاکسار ہے ۔ "مجلس دہشت پسند شاعراں" کے سکریٹری کی حرکت پر بے اختیار ہنسی آئی ۔ کم بخت کو کیا سوجھی ۔

جی میں آیا کہ مولانا سے التماس کروں، کہ مولانا وہ دلآویز لطائف وہ چُست فقرے، وہ برجستہ اشعار جو آپ مشاعروں کی صدارت کے وقت استعمال کیا کرتے ہیں۔ از راہِ کرم ایک کاغذ پہ لکھ کر مجھے ارسال فرمایئے کہ میں صدر کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکوں لیکن وقت تھوڑا تھا اور مولانا کا تقسیمِ ہندوستان کے بعد کا پتہ نامعلوم۔ اس لئے یہی فیصلہ کیا کہ یہ لوازمات خود ہی اکٹھے کئے جائیں۔ لائبریری میں پہونچا وہاں "آبحیات" کے علاوہ اور کوئی کتاب نہ ملی۔ سوچا اس سے کام چل جائے گا۔ لیکن جب مذکورہ بیس لطائف اور بچاس ساٹھ اشعار نقل کر چکا تو یک لخت خیال آیا کہ یہ تو کافی فرسودہ ہیں۔ حاضرین چاہے ان سے محظوظ ہو سکیں لیکن شعرائے کرام کیا کہیں گے۔ اتفاق سے ایک دوست کی وساطت سے "بانگ درا" کا پرانا نسخہ مل گیا اس کی ورق گردانی کی، اچانک نظر "پہاڑ اور گلہری" پر جا پڑی اطمینان کا سانس لیا کہ کم از کم سکریٹری صاحب کے لئے تو ایک شعر مل گیا ہے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے

کالج سے ایک دن کی چھٹی لی، اور صدارت کی "کاغذی تیاریاں" شروع کر دیں۔ سب سے مشکل کام جو نظر آیا وہ تمہید کا مسئلہ تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فقرے لکھے۔

"حضرات! 'مجلس دہشت پسند شاعراں' کے سکریٹری نے مجھ نا اہل کو اس مشاعرے کا صدر بنا کر جس نالائقی کا ثبوت دیا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ انھیں فوراً سکریٹری کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے حضرات! میں شاعر ہوں نہ مسخرا، رہا یہ وہم کہ شاید سخن فہم ہوں، تو حضرات! میری سخن فہمی کا تو یہ عالم ہے کہ اکثر داد دینے کے بعد شاعر سے پوچھتا ہوں کہ اس شعر کا مطلب کیا تھا؟ جس پر میں نے داد دی ہے خواتین و حضرات (خواتین معاف فرمائیں، کہ مجھے ان کی موجودگی کا احساس ذرا دیر سے ہوا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے خواتین و حضرات کہنا چاہیئے تھا) جالندھر مردم خیز شہر ہے۔ اپنے لذیذ گڑ اور لذیذ تر شکر کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر میں بسکٹ بنانے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری بھی ہے۔ جالندھر کے پہلوان یکتائے روزگار ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ان پہلوانوں کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں۔ جالندھر نے ایک عدیم المثال گوّیا اور تین لاجواب شاعر پیدا کئے ہیں جو کہ بالکل کافی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

تمہید کے بعد دوسری چیز شعرا کا مناسب الفاظ میں تعارف کرانا تھا۔ سب سے بڑی دِقّت قاتل مرگھوٹوی کے متعلق تھی۔ سوچا کہ ان کا تعارف یوں کرایا جائے:۔

"خواتین و حضرات! اگر میں غلطی نہیں کرتا تو مرگھوٹہ "یو۔پی" میں ہے اور اگر میں غلطی کرتا ہوں تو "سی۔پی" میں ہوگا۔ اگر "سی پی" میں

میں نہیں تو۔ مغربی بنگال، آسام یا لنکا میں ہو گا۔ بہر حال آپ کو اس سے کیا لینا دینا، آپ قائل صاحب کا کلام سُنیے۔"

قائل صاحب کے علاوہ چند ہندی اور پنجابی کے دہشت پسند بھی اس مشاعرے میں شرکت فرما رہے تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جن کی شکل اور کلام سے میں بالکل ناواقف تھا۔ ان کا تعارف کس طرح کرایا جائے گا بڑی مغز پچی کے بعد ایک ترکیب سمجھ میں آئی یعنی اُن کا تعارف نہایت مبہم اور غیر واضح الفاظ میں کرایا جائے۔

"خواتین و حضرات! اب شری گھُن گھُن جی سے کوتیا سنیے شری گھن گھُن کو دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ میں ان کے متعلق صرف دو باتیں کہوں گا کہ آپ شاعر ہیں اور شاعری کرتے ہیں۔"

"خواتین و حضرات! اب اسٹیج پر ایک ایسا شاعر آرہا ہے جو اکثر اسٹیج پر آتا ہے۔ میں کیا عرض کروں کہ وہ کون ہے۔ جب اسٹیج پر آئے گا آپ اُسے دیکھ ہی لیں گے۔"

اب قریب قریب کاغذی تیاری مکمل ہو چکی تھی اور میں سیاہ بادلوں کے پیچھے روشنی کی روائتی سنہری کرن کا تصور کر کے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ زندگی میں غالباً پہلی دفعہ پلیٹ فارم پر میرا استقبال کیا جائے گا۔ ممکن ہے پھولوں کے ہار بھی پہنائے جائیں۔ پھولوں کے ہاروں کا خیال کرتے ہوئے مجھے اپنی عینک کا خیال آیا۔ عینک کی خاص طور پر حفاظت کرنا پڑے گی۔ چونکہ چند

ہار پہنانے والے کم بخت اس تیزی سے ہار پہناتے ہیں کہ شیشے تو شیشے کمانیاں تک ٹوٹ جاتی ہیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کمل صاحب تشریف لے آئے۔ آپ ایک نوخیز شاعر ہیں اور "قطرہ قطرہ" دہشت پسند بھی ہیں کمرے میں داخل ہوتے ہی دہشت پسندانہ انداز میں بولے "خوشخبری سنیں گے آپ؟"

میں نے کہا "بڑے شوق سے سنائیے۔"

"میرے علاوہ سمن کو بھی جالندھر سے بلاوا آیا ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ سمن صاحب کون ہیں؟"

کمل صاحب نے مسکرا کر فرمایا "صاحب نہیں صاحبہ کہیئے پورا نام سمن کماری سمن ہے۔ ہندی میں لکھتی ہیں اور بچوں کی شاعرہ ہیں۔"

میں نے کہا "لیکن مشاعرہ تو نوجوانوں کے لئے ہو رہا ہے۔ اس میں بچوں کی شاعرہ کا کیا کام؟"

ہنس کر فرمانے لگے "آپ بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں انھیں محض تنوّع کی خاطر مشاعرے میں مدعو کیا گیا ہے۔"

اس سے قبل کہ میں کمل صاحب کو سگریٹ پیش کرتا، وہ خود ہی ایش ٹرے سے میرا سگریٹ اٹھا کر پینے لگے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جاتی دفعہ کہنے لگے۔

"میں آپ اور سمن اکٹھے ہی سفر کریں گے۔ ذرا دل لگی رہیگی۔"

گاڑی چلنے میں ابھی دو تین منٹ باقی تھے کہ کمل صاحب ایک موٹی بھدی اور بدصورت عورت کی معیت میں ڈبے میں داخل ہوئے جن کا تعارف آپ نے شمن کماری شمن کے نام سے کرایا۔ شمن کماری کا سراپا میں اس لئے بیان نہیں کرنا چاہتا کہ آپ کو پڑھ کر کوفت ہوگی۔ مختصراً یہ کہ ایک ایسی عورت کا تصور ذہن میں لائیے جسے دیکھ کر انسان لرزہ براندام ہو جائے۔ ایک عجیب ٹھسّے سے آپ میری بغل کی سیٹ پر بیٹھ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"آپ ہندی جانتے ہیں؟"

میں نے جواب میں کہا "معمولی واقفیت ہے۔ پڑھ لیتا ہوں لکھ نہیں سکتا"

"آپ نے شمن پٹاری دیکھی؟"

"نہیں"

"شمن کیاری؟"

"نہیں"

"شمن چنگاری؟"

"نہیں"

"خیر کوئی بات نہیں میرے پاس تینوں موجود ہیں۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے جھٹ اپنے بیگ میں سے ہندی کی تین چھوٹی چھوٹی کتابیں نکالیں۔

کوبیتا سنیں گے آپ ؟"

میں نے مجبوراً اثبات میں سر ہلایا

" یہ ایک کوبیتا ہے" انھوں نے شاید شمن پٹاری کھولتے ہوئے کہا۔ " جو میں نے اکیس برس کی عمر میں لکھی تھی۔ پہلا بند ہے۔

" شوں شوں کرتی
شاں شاں کرتی
بھاک بھاک کرتی
شاک شاک کرتی
چلی جا رہی ہے
اک گاڑی "

میں نے رسمی طور پر تعریف کرتے ہوئے کہا "پہلا بند تو خوب ہے۔

ہاتھ کے اشارے سے مجھے پرے ہٹاتی ہوئی بولیں " اجی چھوڑیئے آپ نے تو ہمیں بنانا شروع کر دیا پہلے کوبیتا تو سن لیجیے۔"

کھرر ڑ کھرر ڑ کھڑ
کھڑ کھڑ کرتی
گھرر ڑ گھرر ڑ گھڑ
گھڑ گھڑ کرتی
بھرر ڑ بھرر ڑ بھڑ

بھڑ بھبڑ کرتی
چلی جارہی ہے
اک گاڑی"

"خوب خوب" کمل صاحب نے داد دیتے ہوئے کہا "ریل کی رفتار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی"

شاک شوں شاک شوں
شاک شوں کرتی
چھپ چھوں چھپ چھوں
چھپ چھوں کرتی
ٹپ ٹوں ٹپ ٹوں
ٹپ ٹوں کرتی
چلی جارہی ہے
اک گاڑی

اس "کو تیا" کے اکیس بند تھے کیونکہ انھوں نے یہ نظم اکیس برس کی عمر میں لکھی تھی۔ یہ بھی خبر گزری کہ اس نظم کے لکھنے کا خیال انھیں تیس برس کی عمر میں نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نظم فرنٹیر میل یا بمبے ایکسپریس سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ کیونکہ کسی مقام پر ٹھہرنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جب نظم ختم ہوئی تو میں نے کمل صاحب کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ انھوں نے میری بے بسی سے لطف اٹھاتے ہوئے

کہا "کہیے کیا خیال ہے؟"

میں نے رسماً کہا "شمن صاحبہ نے تو کمال کر دیا۔"

شمن صاحبہ نے تعریفی جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا

"اجی چھوڑیے، اس میں کمال کی کون سی بات ہے۔ اچھا اب سنیئے کوئل اور کوّا"

ایک تھا کوّا
ایک تھی کوئل
کوئل کوکی
کُوکُو کُوکُو
کوّا بولا
کائیں کائیں
کوئل اب کے
کچھ نا بولی
کوّا بولا "کوئل پیاری!
گھر کر آئی بدریا کاری
آؤ چلو جمنا تٹ جائیں
ناچیں کودیں شور مچائیں"
کوئل کوکی
کُوکُو کُوکُو

کوّا بولا "کائیں کائیں"
میں نے ان دونوں کو ڈانٹا
کیا کرتے ہو؟ ہائیں! ہائیں!!

اس دفعہ مجھے کہنا پڑا "بہت خوب" سمن کماری مچل گئیں "ابھی چھوڑیے۔ ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے؟ ذرا دو چار سن لیجیے اس کے بعد دل کھول کر تعریف بھی کر لیجیے گا" چنانچہ اس نظم کے بعد انھوں نے متعدد نظمیں "چوہے چوہیا پر" "ابابیل پر" "مرغابی پر" "شترمرغ پر" "تیتر پر" "لنگور پر" "بارہ سنگھے پر" اور خدا جانے کس کس پرند اور جانور پر سنائیں۔ اس دوران میں نے کئی بار ان سے التجا کی کہ ایک آدھ نظم مشاعرے کے لئے بھی رہنے دیجیے، لیکن ہر بار انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "اجی چھوڑیے، نظموں کی ہمارے یہاں کمی نہیں۔ اور ضرورت پڑے تو اسٹیج پہ کھڑے کھڑے تیار کر سکتے ہیں"

جب یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا تو سوچا کہ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں، لیکن پھر خیال آیا کہ مشاعرے کی صدارت کون کرے گا؟

خدا خدا کر کے جالندھر کا اسٹیشن آیا۔ ہم تینوں پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر "مجلس دہشت پسند شاعراں" کے ارکان کا انتظار کرنے لگے۔ پانچ دس، پندرہ منٹ انتظار کیا لیکن کوئی شخص ہماری طرف آتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ سخت پریشان ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے، قلی سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک ہر ریلوے ملازم سے پوچھا کہ بھئی تم نے مجلسِ دہشت پسند شاعراں

کے کسی رکن کو اسٹیشن کے احاطے میں کہیں چلتے پھرتے دیکھا، ہر شخص نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ شمن نے کہا "چلیئے تانگہ لیکر مجلس کے دفتر میں چلتے ہیں۔"

جب اسٹیشن سے باہر آئے تو پہلا شخص جو ملا وہ ایک مقامی اخبار کا ضمیمہ فروش تھا۔ تانگہ دیکھتے ہی اس نے ضمیمہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے چلاکر کہا "مجلس شاعراں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ مجلس کے تمام ارکان گرفتار کر لئے گئے" یہ دہشت ناک خبر سن کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ کمل صاحب بھی کافی مایوس ہوئے کیونکہ انھیں مشاعرہ میں ایک خاص نظم پڑھنا تھی لیکن شمن کماری ازحد مسرور ہوئیں "چلو یہ بھی اچھا ہوا" انھوں نے مسکرا کر کہا" میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا" تو گویا آپ کو مسرت ہوئی کہ مشاعرہ نہیں ہو رہا" کہنے لگیں" میں سوچ رہی ہوں کہ آپ کو باقی کویتائیں سنانے کے لئے وقت بھی ملے گا یا نہیں۔ چلیئے مشاعرے سے تو چھٹی ملی۔ کافی ہاوس چلتے ہیں، وہاں آپ کو "شمن چنگاری" سے چند کویتائیں سنائیں گے۔"

نظموں کا ذکر سن کر میں گھبرایا لیکن اس اثنا میں شمن صاحبہ نے تانگے والے کو کافی ہاوس چلنے کے لئے کہہ دیا۔

طوعاً وکرہاً کافی ہاوس پہونچے۔ شمن صاحبہ نے شمن چنگاری کھولتے ہوئے کہا:-

"اس کتاب میں ان پرندوں اور جانوروں پر نظمیں ہیں جو ہندوستان میں نہیں پائے جاتے مثلاً ایک پرندہ "کھٹ مٹوا" ہے۔ بڑا پیارا پرندہ ہے۔ اسٹریلیا اور وسطی افریقہ کے جنگلات میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ میں نے اس پہ ایک گیت لکھا ہے:۔

کھٹ مٹوی کی آنکھ کا تارا
کھٹ مٹوا ہے پیارا پیارا
آدھی پیلی، آدھی کالی
آنکھیں جیسے مد کی پیالی
جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
کھٹ مٹوے کی جیبیں خالی
کدھر تمھارا بٹوا رے
کھٹ مٹوا کھٹ مٹوا رے

کافی کے دور پہ دور چل رہے تھے اور شمن چنگاری کے اوراق آہستہ آہستہ الٹتے جا رہے تھے لیکن دل و دماغ پہ ایک وحشت طاری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کافی ہاؤس کی دائیں دیوار سے سر پھوڑ لوں، یا زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ جب کتاب قریب نصف ختم ہوگئی تو شمن صاحبہ نے مجھ سے پوچھا "آپ اکتا تو نہیں گئے۔ بس اب تئیس نظمیں اور رہیں۔"

میں نے ظاہرداری قائم رکھتے ہوئے کہا "اکتا یا تو نہیں

البتہ ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سامنے کی دکان سے ایک دوست کو فون کر آؤں۔"

"بڑے شوق سے" سمن صاحبہ نے فرمایا" میں اتنے میں کمل صاحب کو" لم ڈگ ڈگ پر ایک کوتیا سناتی ہوں"۔

باہر کھلی فضا تھی۔ آسمان میں تارے چمک رہے تھے اور چودھویں کا چاند ایک اونچی عمارت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ کافی ہاؤس کے ماحول کا اثر زائل کرنے کے لئے دو تین دفعہ زور زور سے سانس لینے کے بعد میں سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا، معاً میری نظر ایک پولیس انسپکٹر پر پڑی، وہ کافی ہاؤس کی طرف آ رہا تھا۔ جوں ہی وہ ذرا میرے قریب آیا میں نے نہایت دردمندانہ لہجے میں کہا۔

"آپ پولیس انسپکٹر ہیں؟"

"جی ہاں"

"مجھے گرفتار کر لیجئے۔"

"گرفتار کر لوں! لیکن آپ کا جرم؟"

"میرا جرم یہ ہے کہ میں سخن فہم ہوں۔"

شن شن شان

ملک شن شن شان (جسے کچھ لوگ شن شک شان بھی کہتے ہیں)
آزاد ہوئے اب لگ بھگ بارہ سال ہو چکے تھے۔ لیکن اس بارہ
برس کے عرصے میں اس کے سوا کہ ملک آزاد ہو گیا تھا اور کچھ بھی نہیں
ہوا تھا۔ زمین پہلے کی نسبت سخت تر تھی اور آسمان دور تر۔ یہ
درست ہے کہ جب ملک آزاد ہوا تھا تو شن شن شانی جھنڈے
لہرائے گئے تھے، شن شک شانی ترانے گائے گئے تھے لیکن وہ
تو اب ماضی بعید کی بات تھی۔ ملک کا جو حال اس وقت تھا اس کے
پیش نظر بہت کم صحیح العقل انسان یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی آزاد
ہیں۔ البتہ عوام جنھیں ہر صدی اور ہر ملک میں جُل دیا گیا ہے لیڈروں
کے بار بار یقین دلانے پر یہ ماننے کو تیار ہو گئے تھے کہ انھوں نے

غلامی کا جوا اتار پھینکا ہے۔ ان میں سے بھی بعضوں کا ایمان کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ کسی مقامی رہنما کی کوٹھی پر جاتے اور اس سے کہتے۔

حضور! ہمیں بتائیے کیا ہم واقعی آزاد ہیں۔ کیا واقعی ——
—— ہمیں یقین دلا دیجیے۔ ایک بار پھر یقین دلا دیجیے حضور!"

اس پر وہ گھبرا کر ان کی طرف دیکھتا۔ اور ایک ساعت کے لئے نگاہیں نیچی کر لیتا۔ اس کی نگاہ اپنے کمخواب کے جُبّے پر پڑتی پھر وہ نگاہ اُٹھا کر کمرے میں پڑے ہوئے قیمتی سامان کا جائزہ لیتا۔ اس کی آنکھ میں ایک چمک لہرانے لگتی " ہاں ہاں ہم آزاد ہیں بالکل آزاد یقین کیجیے مجھ پر یقین کیجیے۔ کیا یہ کافی ثبوت نہیں کہ ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ آپ سب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اور۔ میں آپ کا خادم ہوں " وہ عوام کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے نظر چرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا " یقین جانو ——————"

ملک کے آزاد ہونے کے بعد ملک میں ایک زبردست طوفان آیا تھا جس کی ذمہ داری عوام نے قومی بازیگروں سے اور قومی بازیگروں نے عوام سے منسوب کی تھی لیکن موخّر الذکر نے اعلان کر دیا تھا کہ ایک معمولی حادثے کو زبردست طوفان کا نام دینا مبالغہ آمیزی کی انتہا ہے۔

شن شن شان کے آزاد ہونے کے بعد راہنماؤں کی سب سے

بڑی ایجاد" ایک تکیہ کلام تھا جسے وہ ہر موقع پر استعمال کرکے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیتے تھے۔ وہ تکیہ کلام تھا "الہ دین کا چراغ" یہ تکیہ کلام واقعی بڑے کام کی چیز تھا کیونکہ مشکل لمحوں میں ہمیشہ آڑے آتا تھا۔

عوام پکارتے "حضور! ہمیں روٹی نہیں ملتی" تو جواب ملتا "کیا ہمارے پاس الہ دین کا چراغ ہے؟ کہ ہم آپ کو چشم زدن میں روٹی مہیا کر دیں"

"حضور! کپڑا نہیں ملتا"

انتظار کیجئے۔ ہمارے پاس الہ دین کا چراغ نہیں کہ راتوں رات کپڑا تیار کرنے کا کارخانہ لگا دیں۔

"جناب! نمک نہیں ملتا"

"نمک کے بغیر گزارہ کیجئے، آخر ہمارے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں کہ آپ کو....... "

جب سے ملک آزاد ہوا تھا، ارباب حکومت نے کام کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ نکالا تھا، یعنی عوام کو کھلی اجازت دیدی تھی کہ اپنی ہر شکایت مقامی افسروں کے گوش گزار کریں۔ وہ اس شکایت کو غور سے سنیں گے اور اپنی رپورٹ اعلیٰ افسروں کے پاس بھیج دیں گے، جو اُس رپورٹ کو نہایت غور سے پڑھیں گے اور اس پر اپنے دستخط کر کے جناب وزیر اعظم کی خدمت میں ارسال کر

دیں گے۔ وزیر اعظم صاحب فائل کا بغور مطالعہ کریں گے اور بغور مطالعہ کرتے رہیں گے، اور پھر کسی فرصت کے لمحے میں اس کام سے متعلق، ایک کمیٹی مقرر کر دیں گے اور ممبران کمیٹی کو یہ حق عطا فرمائیں گے وہ عوام کی شکایات پر غور کریں، اور غور کرتے رہیں۔ چاہے اس وقت تک غور کرتے رہیں جس وقت تک وہ شکایات خود بخود رفع ہو جائیں

ایک دفعہ ایک شہر میں لوگوں کو پانی کی کمی محسوس ہوئی اور وہ پیاس کی شدت سے بے حال ہونے لگے۔ حکومت نے ایک پانی کمیٹی مقرر کی جو چھ مہینے کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ پانی تو بہت عام چیز ہے اور قدرت کی ان نعمتوں میں سے ہے جو مفت ہر خاص و عام کے حصے میں آتی ہیں۔ جسے قدرت نے بہم پہنچانے کے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ پانی کی کمیابی کی شکایت کا تعلق قدرت سے ہے حکومت سے نہیں۔ بلکہ ایسی شکایت تو حقیقتاً قادرِ مطلق کی توہین کے مترادف ہے ویسے تو حکومت پانی کا انتظام فی الفور کر سکتی ہے کیونکہ چشمہ ویری ناگ سے پانی لانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا انتظام کرنا اب بیکار ہے چونکہ وہ تمام لوگ جو پانی پانی پکارتے تھے اب اس دنیائے آب و گل میں نہیں ہیں اس لئے کاغذات فائل کر دیئے ہیں۔

ملک کے آزاد ہوتے ہی قومی رہنماؤں نے رفاہِ خلائق کے لئے بڑے بڑے پراجکٹ تیار کر لئے تھے۔ یہ پراجکٹ دودھ اور شہد کی نہریں چلانا، ہر مجرد کے لئے بیوی مہیا کرنا۔ غریبوں کے لیے شیش محل

بنانا اور اس قسم کی دیگر تجاویز پر مشتمل تھے لیکن اتنی جلدی یہ پراجکٹ کیسے شرمندۂ تکمیل ہو سکتے تھے۔ اربابِ بسط وکشاد کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ تو نہ تھا۔

لیکن ٹھہریے اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ چراغ وہی چراغ ہے جو پردۂ سیمیں پر دکھایا جاتا ہے اور جس کے رگڑنے سے وہ جن سے بلی تھیلی خسینہ آموجود ہوتی ہے۔ ایسے چراغ تو شاید ہوں لیکن الہ دین کا جن والا چراغ تو نہیں تھا۔

الہ دین کا چراغ نہ ہونے کی وجہ سے عوام مایوس ہونے لگے لیکن رہنماؤں کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ چند دن کے اندر اندر وہ ملک کی کایا پلٹنے میں کامیاب ہوجائیں گے

رفتہ رفتہ ملک سے ہر وہ چیز غائب ہونے لگی جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ چاول۔ کھانڈ، سگریٹ۔ نمک۔ عوام نے مقامی افسروں سے شکایت کی کہ کوئی چیز کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے حسبِ معمول اس حادثے کی اطلاع حکام بالا کو پہنچادی۔ حکام بالا نے وزیراعظم کو مطلع کیا اور وزیراعظم نے ایک مختصر تار میں عوام کو تلقین کی کہ اگر کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو عوام کو غمِ ملت کھانا چاہیے۔

چند سال عوام غمِ ملت کھاتے رہے لیکن جب اس سے شکم پری نہ ہوئی تو انھوں نے پرائم منسٹر کو لکھ بھیجا:۔

"حضور! ہم غمِ ملت کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ کوئی دوسری چیز بھیجئے۔"

پرائم منسٹر نے جواب لکھا "خاکسار اس معاملہ میں مجبور ہے آپ شہنشاہ ٹشن شن شان سے براہ راست خط و کتابت کیجئے۔"

چنانچہ عوام نے شہنشاہِ شن شن شان کی خدمت میں ایک درخواست خون کے آنسوؤں سے لکھ کر گزاری۔ شہنشاہِ شن شن شان نے اس درخواست کو پڑھنے کے بعد حکم صادر کیا کہ وہ بہ نفسِ نفیس آزادی کی بارھویں سال گرہ پر عوام سے خطاب کریں گے۔

بارے آزادی کی بارھویں سال گرہ آئی اور شن شن شان کے دارالخلافے میں حضور شہنشاہ نے بیس لاکھ کے مجمع میں جو ملک کی آبادی کا نوّے فیصدی حصّہ تھا ایک نہایت مدلل تقریر کی:۔

"حضرات! آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بھوکوں مر رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آپ کا وہم ہے آپ کو ضرور کسی شخص نے بہکایا ہے۔ ورنہ آپ کو یہ وہم لاحق نہ ہوتا۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے بارہ سال کے عرصے میں آپ کے لئے کیا کیا۔ آپ سخت ناشکرے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس مختصر وقت میں میں نے آپ کی بہبودی کے لئے کم از کم بارہ ہزار اسکیمیں تیار کی ہیں۔ جن میں سے

چند پر مستقبل قریب میں عمل بھی کیا جائے گا۔

میری طرف دیکھئے۔ کیا میں نے صرف آپ کی خدمت کے لئے اس عہدے کی مصیبت اپنے سر نہیں لی؟ مجھے چھوڑیئے۔ میں نے اپنے پانچ درجن عزیزوں کو صرف اس لئے بڑے بڑے عہدوں کی مصیبت میں ڈال رکھا ہے کہ وہ صبح و شام آپ کی بہتری کے لئے پراجکٹ تیار کرتے رہیں۔ کیا ہم آپ کے مفاد کے لئے قربانی کے بکرے نہیں بنے؟ بولیئے!

آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے حکومت کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ یہ الزام بھی بہت حد تک درست ہے۔ حضرات! میں نے ساری عمر جیل خانے یا قوم کے لئے جوشیلے نعرے ایجاد کرنے میں گذاری۔ ان حالات میں آپ مجھ سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ آخر میرے پاس الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ راتوں رات ایک قابل رشک حکمران بن جاؤں۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھئے انشاء اللہ آیندہ پانچ برس میں آپ کو ایک لائق قدر شہنشاہ بن کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ آپ اس عرصے میں کسی کے بہکانے پر بھوکوں نہ مر جائیں۔

حضرات! بارہ سال کا عرصہ قوموں کی زندگی

میں ایک لمحے سے بھی کم وقعت رکھتا ہے۔ آپ کو
اتنی جلدی مایوس نہیں ہوجانا چاہیئے تھا۔ آپ
کہتے ہیں آپ کو گیہوں نہیں ملتی، گیہوں نہیں ملتی
تو جَو نہیں ملتے۔؟ باجرہ کھائیے۔ باجرہ نہیں ملتا
فاقہ کیجئے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ زیادہ سے
زیادہ آپ مسلسل فاقہ کی وجہ سے مرجائیں گے
لیکن حضرات! میری دانست میں قوم کے لئے
جینے سے قوم کے لئے مرجانا کہیں افضل ہے۔ آپ
اپنی ۲ کروڑ سالہ تاریخ پر نظر دوڑائیے۔ اپنے
اسلاف کے کارناموں کا جائزہ لیجیے۔ اپنی روایات
کا مطالعہ کیجئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ فاقہ مستی
ہمارا سب سے بڑا اور سب سے قیمتی ورثہ ہے۔
(تالیاں)

مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود بہترین سامان
اکل و شرب میسر ہیں اس لئے میں اس سعادت
سے محروم ہوں کہ جو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ لیکن
حضرات! آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ قوم کے
لئے فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں بشرطیکہ
وہ زندہ رہیں، آپ پر رشک کریں گی اور مستقبل کا

مورخ، اگر واقعی کوئی مستقبل کا مورخ ہوا، آپ کی قربانیوں کا ذکر سنہرے الفاظ میں لکھے گا۔ آپ فاقہ کشی کا ایک نیا معیار قائم کر رہے ہیں کیونکہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں بھوکوں مر رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے آپ کی فاقہ مستی ایک دن ضرور رنگ لاکر رہے گی۔ اس بات کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اس امر کا کہ مجھ سے بہتر آپ کو کوئی دوسرا شہنشاہ نہیں مل سکتا۔

حضرات! آپ کو اپنے فرائض پہچاننے چاہئیں مدت ہوئی میں نے ایک تقریر میں آپ کے فرائض ان الفاظ میں متعین کئے تھے کہ آپ کو ہر حالت میں قوم و ملک کی خاطر مرنا ہے تاکہ آپ کا عزیز وطن شن شن شان اور آپ کا عزیز تر شہنشاہ زندہ رہ سکے۔ میں اس لئے اور زیادہ نہیں کہوں گا کیونکہ مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی ہے اور میرا خانساماں میرا انتظار کر رہا ہے۔

خیر میں وہ بات تو ہرگز نہیں کروں گا کہ آپ روٹی مانگنے آئیں اور میں آپ کو کھانے کے لئے پتھر پیش کروں۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ مجھے فی الحال

الہ دین کا چراغ دستیاب نہیں ہوا۔ جس کی مدد
سے میں بیس لاکھ کے انسانوں کے لئے پتھر کی
مطلوبہ مقدار کا انتظام کر سکوں۔ لیکن میں نے
آپ کو پتھر سے بہتر چیز دی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ
تقریر۔ آپ اب بڑی خوشی سے اپنے گھروں کو
واپس جا سکتے ہیں۔ ہاں اگر غیر مناسب نہ سمجھیں تو
ایک نعرہ شن شن شان زندہ باد لگاتے جائیے اور
خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کے شہنشاہ کی عمر دراز
کرے اور اسے جلد از جلد الہ دین کا چراغ بہم پہونچائے
شب بخیر! "

شن شن شان (جسے کئی لوگ شن شاک شان بھی کہتے ہیں)
کے عوام خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹے اور اس رات ہر مندر اور
مسجد میں دعائیں مانگی گئیں کہ خداوند کریم یعنی ایشور پرماتما شہنشاہ
شن شن شان کو اپنی پہلی فرصت میں الہ دین کا چراغ بہم پہونچائے

شہید

جلوس اب مرگھٹ بازار میں سے گذر رہا تھا۔ یکایک جلوس کے لیڈر کو جس کی لمبی داڑھی دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے یہ ڈاڑھی نہیں جھاڑن ہے۔ خیال آیا کہ جلوس ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ چنانچہ اس نے پوری طاقت سے چلا کر کہا "تحریک خباثت" ہجوم نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا "زندہ باد"

"مہر و مروّت"

"مردہ باد"

"ہم کیا چاہتے ہیں ؟"

"فتنہ و فساد"

لیڈر کو یقین ہو گیا کہ ہجوم میں زندگی کے کافی آثار ہیں۔ اور

جلوس بازار میں سے گذرتا ہوا اگر گٹ روڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

ماتا دین اس جلوس کا نفرت روڈ سے تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے غلیظ بال بڑھے ہوئے اور نگاہیں گرسنہ تھیں۔ پچاسویں بار اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے دائیں بائیں چلنے والے افراد کی جیبوں کی طرف نگاہ دوڑائی اور پچاسویں بار اسے مایوسی ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کسی شخص کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی پھوٹی کوڑی تو خیر بہت بڑی بات تھی، یہاں تو ایسے لوگ بھی تھے جن کے جسم پر پھٹی ہوئی قمیص تک نہ تھی۔ ماتا دین کو ان لوگوں پر بے حد غصہ آیا، اور اس نے زیر لب انھیں دو ایک موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اس کا جی چاہا کہ جلوس کے لیڈر کی لمبی داڑھی پکڑ کر اس سے کہے "تحریک خلافت! خوب!! لیکن یہ کہاں کی خلافت ہے کہ کسی شخص کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں کہ ایک فاقہ کش جیب کترا جیب کاٹ کر کھانا کھا سکے"

آج ماتا دین کا تیسرا فاقہ تھا۔ بھوک کی شدت سے وہ نڈھال ہو رہا تھا، اس کا دماغ چکرا رہا تھا اور ہر قدم پر اسے یوں محسوس ہوتا تھا گویا ابھی لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے گا۔ لیکن اتنے بڑے جلوس میں لڑکھڑانا بھی تو محال تھا۔ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اتنی سخت بھیڑ تھی کہ اگر وہ گرنا چاہتا تو بھی شاید نہ گر سکتا۔ اچانک جلوس ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ آگے ٹریفک کا رش تھا۔ جلوس کے افراد آپس میں طرح طرح کی

چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے کہا "سکریٹریٹ اب نزدیک ہے" کسی نے کہا "آج پولیس مداخلت نہیں کر رہی ہے" ماتادین نے اپنے دائیں کھڑے ہوئے شخص کی جیب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ بار یک ململ میں سے اُسے دو ایک روپہلی سکے جھانکتے نظر آئے۔ اس کے خشک لبوں پہ مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس شخص کے اور قریب سرک کر مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے ایک آدھ بار اس شخص کی آنکھ بچا کر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھانے کی کوشش کی لیکن اسے جیب کاٹنے کی جرأت نہ ہوئی۔ دو چار منٹ وہ کشمکش و پیچ میں پڑا رہا۔ آخر اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک بار اور کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس شخص کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا "کیوں جی! یہ جلوس اب چلے گا بھی یا نہیں؟" اس سے پیشتر کہ وہ شخص اسے جواب دیتا کسی نے پیچھے سے آکر اس کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہا "ارے میرے چاند! تو اس مجمع میں کیا کر رہا ہے؟" ماتادین نے مڑکر دیکھا۔ یہ آواز اس کے ہم پیشہ کلو شیخ کی تھی۔ ماتادین نے اسے آنکھ مارتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن کلو شیخ خاموش رہنے والا انسان نہ تھا۔ اس نے ماتادین کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستہ سے اس کے کان میں کہا "دیکھ بیٹا! یہ بات ٹھیک نہیں جلوس میری قوم کے لوگوں کا ہے۔ تم یہاں......" ماتادین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اُسی سرگوشی کے انداز میں جواب دیا "ناراض مت ہو یار آدھا حصہ تمھارا رہا۔" خلاف معمول کلو شیخ نے

زندگی میں پہلی بار اپنے ہم پیشہ کی بات مان لی، جلوس کے لیڈر نے ایک بار پھر ایک پرجوش نعرہ لگایا اور جلوس سکریٹریٹ کی طرف روانہ ہوا۔ کلو شیخ اور ماتادین ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

سکریٹریٹ پہونچنے سے پہلے جلوس کو ایک تنگ گلی سے گزرنا تھا جس کے باہر پولیس نے ہجوم کو روکنے کا مکمل انتظام کر رکھا تھا جیسے ہی جلوس اس گلی کے آخری حصے میں پہنچا ایک مجسٹریٹ نے جو گھوڑے پر سوار تھا، اسے منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ ہجوم نے لیڈر کی طرف دیکھا لیڈر نے مجسٹریٹ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ یکے بعد دیگرے چار پانچ نعرے لگوانے کے بعد جلوس کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ مجسٹریٹ نے آخری تنبیہہ کی لیکن ہجوم پر اس کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ آخر جب ہجوم نے پولیس پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا تو مجسٹریٹ نے پولیس کو لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی، بہت سے لوگ الٹے پاؤں تنگ گلی کی طرف دوڑے، لیکن گلی تنگ تھی اور ہجوم بے پناہ۔ اس بھگدڑ میں کئی بوڑھے اور بچے روندے گئے۔ درجنوں آدمیوں کو چوٹیں آئیں ماتادین نے بھاگتے وقت ٹھوکر کھائی اور زمین پر آرہا۔ پولیس اب گلی میں آ پہونچی تھی اور لوگ سخت گھبراہٹ کے عالم میں بھاگ رہے تھے ہجوم کا ایک ریلا ماتادین کے اوپر سے گزرتا ہوا گلی میں واقع ایک مسجد میں جا گھسا۔ اتنے میں پولیس افسر نے سیٹی بجائی۔ چند لوگ سکریٹریٹ کے دفتر میں بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے انھیں گرفتار کرنا تھا۔ پولیس

کے سپاہی سیٹی کی آواز سن کر تنگ گلی سے باہر کی طرف دوڑے۔
پولیس کے چلے جانے کے بعد جب لوگوں کے اوسان ٹھکانے ہوئے تو انھوں نے گردو پیش نظر ڈالی۔ چند بچے ڈر کے مارے زمین پر پڑے ہوئے تھے، انھیں اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کے لئے کہا۔ کچھ بوڑھے زخمی ہو گئے تھے، ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ ماتادین کو بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر مسجد میں لایا گیا۔ اس کے منھ پر سرد پانی کے چھینٹے دیے گئے اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار ہونے کے لئے کہا گیا لیکن ماتادین بے حس و حرکت زمین پر پڑا رہا۔ یکایک کسی کو خیال آیا کہ اس کی نبض ٹٹولی جائے اس نے ماتادین کی نبض پر ہاتھ رکھا اور تعجب اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا "ارے یار۔ یہ تو ختم ہو گیا!" ایک پنواڑی نے دانت نکالتے ہوئے کہا:۔
"جبھی تو میں سوچوں کہ سالا اٹھے کیوں نہیں"
ماتادین کی وفات کی خبر فوراً تحریکِ خباثت کے دفتر میں پہنچائی گئی۔ آناً فاناً مسجد میں ہزاروں لوگوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ تحریک کے بڑے بڑے لیڈر موٹروں میں سوار ہو کر مسجد میں پہونچ گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے:۔ "یہ کون شخص تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ کیا وہ تحریک کا باقاعدہ ممبر تھا، ہمدرد تھا۔ حامی تھا" تحریکِ خباثت کے کسی لیڈر کو اس شخص کا اتا پتا معلوم نہ تھا، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ اس کا نام ماتادین ہے۔ کیونکہ یہ نام اس کے بازو پر لکھا ہوا پڑھا

گیا تھا۔ لیکن انھوں نے اتفاق رائے سے ماتادین کو شہید کا خطاب دیا اور اعلان کیا کہ مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا جائے۔ تحریک کے اخبارات کو ہدایات بھیجی گئیں کہ مرحوم کی شہادت کا ذکر خاص اہتمام سے کیا جائے۔ اخباروں نے دھڑا دھڑ ضمیمے شایع کئے جن میں مرحوم کی قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے تحریک خباثت کے پہلے شہید کو خراج تحسین ادا کیا گیا۔

اخبار ”ابلیس“ نے لکھا ”غازی ماتادین تحریک خباثت کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ قومی خدمت کا جذبہ آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ آپ کے دادا جان تحریک خباثت کے ایک زبردست ستون تھے۔ مرحوم کی وفات سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے“

اخبار ”حقارت“ نے لکھا ”ہمیں مرحوم کی رفاقت کا فخر حاصل تھا آپ نہایت شریف الطبع انسان تھے۔ اگر انھیں فرشتہ سیرت کہا جائے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کی زندگی بنی نوعِ آدم کی بھلائی کے لئے وقف تھی۔ آپ کی وفات سے ہمیں ذاتی طور پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔“

مرحوم ماتادین کے جنازے کے جلوس میں تقریباً ایک لاکھ افراد شامل ہوئے اور قبرستان تک فضا ”شہید ماتادین زندہ باد! تحریکِ خباثت زندہ باد“ کے نعروں سے گونجتی رہی۔ مرحوم کو دفنانے کے بعد ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے تحریکِ خباثت کے صدر نے کہا:۔

حضرات !

ہم ایک بہت بڑے شہید کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں۔ شہید ماتادین نے اپنی بے مثال شہادت سے ثابت کر دیا ہے کہ تحریک خباثت میں ایسے سرفروش موجود ہیں جو وقت آنے پر جی سے گزر جاتے ہیں لیکن تحریک کا جھنڈا سرنگوں ہونے نہیں دیتے۔ (تالیاں) مرحوم پولیس کے ظالمانہ لاٹھی چارج کے شکار ہوئے (شیم شیم) انھیں چھاتی اور سر پر بہت گہرے زخم آئے۔ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن افسوس وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی قربانیوں کی یاد مدتوں تک ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے انھوں نے تحریک خباثت کی خدمت کی ہے وہ آپ سب پر عیاں ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ انھوں نے اپنے لہو سے ہماری تحریک کو سینچا تو میں حق بجانب ہوں گا۔ مرحوم کے پیش نظر ہمیشہ ایک نصب العین تھا وہ چاہتے تھے کہ قوم کے ہر فرد کی مدد کی جائے اور جہاں تک ہو سکے اس پس ماندہ قوم کا دامن موتیوں

سے بھر دیا جائے" (تالیاں)

ہجوم نے جوش سے بے قابو ہو کر شہید مانا دین زندہ باد کے نعرے لگائے اور صدر کی تقریر کا باقی حصہ اس شور و غل میں نہ سنا جا سکا

دور ایک کونے میں کلو شیخ نے ایک شخص کی جیب کاٹتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا " سالا شہید کہیں کا!"

ہجرت کے فائدے

ظاہر ہے کہ اس مضمون کا "پاکستان کی برکتوں" کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کی برکتیں تو کوئی پاکستانی مورخ ہی بیان کرے گا۔ میرا مطلب ہے اس وقت بیان کرے گا جب پاکستان میں صحیح معنوں میں بولنے اور لکھنے کی آزادی ہو گی یا پاکستانی سرکار کے پاس پاکستان کی مستند تاریخ چھپوانے کے لئے روپیہ ہو گا۔ اس مضمون میں، صرف اُن فوائد کا ذکر کیا جائے گا جو خاکسار کو پاکستان سے ہجرت کرنے سے ہوئے۔

سب سے پہلا اور شاید بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہجرت کرنے سے پہلے میں انسان تھا، اب بفضلِ خدا یعنی شرنارتھی ہوں۔ اور اہلِ ذوق اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو مزہ شرنارتھی ہونے میں ہے، وہ انسان ہونے

میں نہیں۔ شرنارتھی وہ لفظ ہے کہ بقول ڈاکٹر اقبال "پتھر کو بھی گداز کرے" اس لفظ یا لیبل کی بدولت مجھے ملازمت ملی۔ رہنے کو مکان ملا جس کی اگرچہ چھت شکستہ ہے اور دیواریں جھلسی ہوئی ہیں لیکن جس کا کرایہ مجھے ادا نہیں کرنا پڑتا۔ تین مہینے مفت راشن پہننے کے کپڑے، رضائیاں اور کمبل ملے اور اسی لیبل کی بدولت مجھے لوگوں کو اپنے متعلق عجیب وغریب غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا موقع ملا۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے پاکستان میں چھوڑی ہوئی فرضی جائداد یا خیالی شان وشوکت کے بارے میں کیا کیا قصے سنائے ہیں اور اب اگر چند دنوں سے لوگوں کا مجھپر اعتبار نہیں رہا تو قصور میرا ہی ہے۔ کیونکہ کسی سے تو کہتا ہوں کہ لاہور میں میری تین کوٹھیاں تھیں اور کسی سے یہ کہ تین نہیں پانچ تھیں۔ یہی غلطی موٹر کاروں کے بارے میں بھی ہو جاتی ہے۔ آج ایک اجنبی کو جب میں بتا رہا تھا کہ میرے پاس دو رولز رائس کاریں اور ایک جیپ کار تھی، تو اس نے منھ بنا کر کہا "پرسوں تو آپ فرما رہے تھے کہ ایک شیورلٹ اور ایک ٹمٹم تھی" اور مجھے خجالت کو ٹالنے کی غرض سے کہنا پڑا "میرے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ سواری کا پورا پورا انتظام تھا۔"

ملازمت حاصل کرنے میں جتنی مدد مجھے اس لیبل سے ملی شاید ہی کسی شخص سے کسی شخص کو (اگر وہ شرنارتھی نہ رہا ہو) ملی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ہجرت سے پہلے جب کبھی انٹرویو کے لئے جاتا تو بورڈ کے ممبر طرح طرح

کے سوالوں سے ناک میں دم کر دیتے تھے ۔ آپ کی عمر؟ آپ کا قد؟
آپ کی کمر کا ناپ؟ ایم ۔ اے کس درجے میں پاس کیا؟ بی ۔ اے میں
ایک دفعہ کی بجائے دو دفعہ کیوں فیل ہوئے؟ فوجی خدمات؟ سگریٹ
پیتے ہو یا حقہ؟ تجربہ؟"

اب کی بار مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ دراصل میں نے بورڈ
کے ممبروں کو سوال کرنے کی مہلت ہی نہیں دی ۔ جوں ہی کمرے میں داخل
ہوا چلا کر کہا "

"بندہ پرور! میں رجسٹرڈ شرنارتھی ہوں" ۔ ✓

اور بورڈ کے صدر نے ملازمت کا حکم نامہ میرے حوالے کیا ۔

ہجرت سے پہلے مالکِ مکان نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی
تھی ۔ قریب قریب ہر تیسرے مہینے وہ مجھ سے کہتا ۔

" چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کیجئے ورنہ آپ کو اور آپ
کے سامان کو اٹھا کر سڑک پر پھینک دیا جائے گا" ۔

میں اس کے مکان میں تین سال رہا اور اس عرصے میں زیادہ
نہیں تو اس نے مجھے ایک درجن رجسٹرڈ نوٹس دیئے ۔ ہر بار عدالت میں
جانے کی بجائے میں پانچ روپے کا اضافہ کرتا رہا ۔ یہاں تک کہ جب مجھے
آخری نوٹس ملا تو کرایہ اور میری تنخواہ میں صرف پانچ روپے کا فرق رہ
گیا تھا ۔ میں نے مالکِ مکان کو گڑگڑا کر کہا " آپ خوامخواہ مجھے عدالت
میں گھسیٹتے ہیں ۔ چلئے پہلے میں تنخواہ بیوی کو لا کر دیا کرتا تھا ، اب

آپ کا نذر کر دیا کروں گا۔"

اس نے نہایت بے دلی سے یہ تجویز مان لی۔ لیکن میں سوچتا ہوں اگر پاکستان نہ بنتا اور مجھے لاہور ہی میں رہنا پڑتا اور تین ماہ کے بعد وہ مجھے سولھواں نوٹس بھیجتا تو اس وقت میری کیا حالت ہوتی۔ اب وہ بھی میری طرح خانہ بدوش ہے اور ایک ایسے مکان میں گزر کر رہا ہے جس کی نہ چھت ہے نہ دیواریں یعنی صرف فرش ہی فرش ہے

لاہور ویسے تو بڑا اچھا شہر تھا۔ مختصر جامع، خوبصورت لیکن اس میں ایک قباحت تھی۔ وہ یہ کہ پندرہ برس کے عرصے میں میں نے اپنے ارد گرد اتنے واقف کار اور احباب اکٹھے کر لئے تھے کہ میرے بیشتر لمحات ان کی خاطر و تواضع کرنے یا ان کے ساتھ گپیں ہانکنے میں صرف ہوتے تھے۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا تھا کہ ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں۔ آخر خدا نے سن لی۔ پاکستان معرض وجود میں آیا۔ ان میں سے اکثر تو پاکستان میں شہید کر دیے گئے (پاکستان زندہ باد!) اور کچھ ہندوستان کے مختلف شرنارتھی کیمپوں میں ہیضہ یا چیچک سے مر گئے (جے ہند)...... کم بخت جو سخت جان تھے۔ وہ دہلی یا دہلی سے پرے گمنام شہروں میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان میں سے دو ایک نے اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے میرا اتا پتا پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ میں کہاں ہوں، کیسا ہوں؟ لیکن میں نے اپنی قیام گاہ کا کسی کو پتہ نہیں دیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "میاں! میں بھی کچی گولیاں نہیں

کھیلا۔ میں سب جانتا ہوں کہ تم میرا سُراغ لگانے کے لئے کیوں
بے قرار ہو۔ اسی لئے نا ؟ کہ وقت بے وقت میرے ہاں آکر دھما چوکڑی
مچاؤ۔ رات کے ایک بجے تک میرا دماغ چاٹتے رہو اور جاتے ہوئے
میرے بہترین سگریٹوں کا ڈبہ اٹھا کر لے جاؤ، یا اس دردناک لہجے میں
اُدھار مانگو کہ میں انکار نہ کر سکوں۔ میں جہاں بھی ہوں اچھا ہوں
مجھے اپنے حال ہی پر رہنے دو۔"

لیکن میں آجکل کہاں ہوں ؟ اور کس حال میں ہوں ؟ میں
ایک ایسے قصبے میں ہوں جس کے اِردگرد ریت کے انبار اور
سرکنڈوں کے پودے ہیں جن میں گرد آلود ہوا میری کھوئی ہوئی
روح کی طرح سارا دن سائیں سائیں کرتی رہتی ہے اس قصبے کے
باہر قدم قدم پر بسیط و عریض ویرانے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر کئی
بار مجھے خیال آتا ہے کاش! مغل بادشاہ راوی اور جمنا کے
کناروں پر اپنے مقبرے تعمیر کرانے کی بجائے یہاں تعمیر کراتے
ایک ایسا قصبہ جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ جہاں میں کسی کو نہیں جانتا
جہاں کوئی کافی ہاؤس نہیں۔ سینما گھر نہیں، ادبی ماحول نہیں
جہاں کچھ بھی نہیں ۔ جہاں مرد ریت سے خشک تر اور عورت سرکنڈوں
سے زیادہ خطرناک ہیں ۔ جہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ جہاں یہ ہو کر
یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات سمٹ کر ایک خاموش
اور ساکن صحرا میں سما گئی ہے ۔

لیکن میں خوش ہوں کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ مالک مکان مجھے سڑک پر پھینکنے کی دھمکیاں نہیں دیتا اور یاروں نے اتنی دور بستیاں بسائی ہیں کہ بقول فراق اتنی دور سے ان کی یاد بھی میرے پاس نہیں آسکتی۔

مکرّمی و محترمی!

لیڈر کے نام—

محترمی!

جب سے حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آئی ہے آپ کی تقریریں پڑھ پڑھ کر ادھ موا ہو گیا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں آپ تقریر کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کرتے۔

میں جب اخبار اٹھاتا ہوں تو اس خیال سے سہم سا جاتا ہوں کہ حسب معمول اس میں آپ کی تقریر ضرور ہوگی۔ ستم یہ ہے کہ آپ ہر تقریر میں وہی بات کہتے ہیں جو یا مجھے پہلے سے معلوم یا بالکل غلط ہے۔ مثلاً ایک پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "ملک کو پاگلوں کی ازحد ضرورت ہے" بندہ پرور خود ہی انصاف فرمایئے کہ سر پھرے قومی رہنماؤں، جاہل ادیبوں، خود غرض پنڈتوں اور ملاؤں کی موجودگی میں آپ کا ارشاد کہاں تک درست ہے۔ عموماً آپ اپنی

ہر تقریر میں تین باتیں دہراتے ہیں
"(۱) ملک نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔
(۲) پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کشیدہ تر ہو رہے ہیں۔
(۳) مہاجرین یا شرنارتھیوں کا مسئلہ حل ہوتے نظر نہیں آتا۔"
حضور! میرے لئے یہ انکشافات نئے ہیں نہ حیرت انگیز۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ جب تک آپ برسر اقتدار رہیں گے، ملک نازک ترین دَور سے گزرتا رہے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کبھی شریف ہمسایوں کی طرح نہیں رہ سکیں گے۔ رہا مہاجرین کا مسئلہ وہ صرف اُس وقت حل ہوگا جب مہاجرین دنیائے آب و گل میں نہیں رہیں گے۔
آپ فرماتے ہیں "کچھ اور عرصہ ہم پر اعتماد رکھیئے۔" گستاخی معاف میں تو اعتماد رکھتے رکھتے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ بقول داغ مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں ورنہ شاید میں اس اعتماد کے سلسلے کو اور طول دیتا۔
اپنی تقریروں میں آپ ہر روز سیکڑوں پیشین گوئیاں کرتے ہیں مثلاً مستقبلِ قریب میں لاکھوں آدمی بھوک، طاعون، ہیضہ کے شکار ہونے والے ہیں، ہمارے ملک پر متعدد حریص ممالک کی نظریں ہیں اور وہ عنقریب ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ میں اس انہماک سے قوم کی خدمت کر رہا ہوں کہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

حضور! آپ ہمیں اس قسم کی ہزاروں باتیں بتاتے ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کس تاریخ یا سن تک ہمارے اعتماد کے اہل ثابت ہوں گے۔ آپ کی تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ چور بازاری کو سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔ مجھے حیرانی ہے کہ آپ کو چور بازاری کا علم ہے لیکن اس کے باوجود آپ اسے بند نہیں کر سکتے۔ حضور! وہ آپ کی خفیہ پولیس، عدالتیں، سزائیں کیا ہوئیں۔ اگر آپ چور بازاری کا انسداد کرنے میں واقعی بے بس ہیں تو کم از کم اسے قانوناً جائز ہی قرار دے دیجئے۔ تاکہ ہم دوسرے ممالک کو منہ دکھانے کے قابل تو ہو سکیں۔

لیکن میرا سب سے پہلا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ ملک کو چاہے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے یا نہیں، آپ کی زبان اور پھیپھڑوں کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔

خیر اندیش

ترقی پسند دوست کے نام

مکرمی!

تمھارے افسانوں کا مجموعہ "درانتی کے دانت" نظر سے گزرا پڑھنے کے بعد فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا نام "ہاتھی کے دانت" ہونا چاہیئے تھا یا "درانتی کے دانت"!

ظالم لکھنے کو تو تم نے افسانے لکھے ہیں لیکن دراصل "مارکسیت" پر اچھے خاصے مضامین لکھ ڈالے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تمھارے افسانوں سے کرداروں کے نام اور دو ایک خوبصورت تشبیہیں نکال دی جائیں تو انھیں آسانی سے کارل مارکس کے فلسفے کا ضمیمہ تصور کیا جا سکتا ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ بعض افسانوں سے نہ بھی نکالے جائیں تو شاید کام چل جائے۔

اپنی کتاب کے دیباچے میں تم لکھتے ہو "اب وقت آگیا ہے

کہ ہر ادیب کھلم کھلا اشتراکیت کا پراپیگینڈا شروع کر دے"۔
اے دوست! سچ سچ بتانا تجھے یہ الہام کب اور کیسے ہوا۔ اگر تجھے اشتراکیت کا پروپیگنڈا کرنا ہی مقصود ہے تو اس غرض کے لئے افسانے لکھنا ہی کیوں لازم ٹھہرا۔ یہ مطلب تو افسانے لکھے بغیر بھی پورا ہو سکتا ہے۔ آخر بھلا کارل مارکس کہاں کا افسانہ نگار تھا۔ مجھے اشتراکیت سے چڑ نہیں، لیکن اس بات سے ضرور ہے کہ ہر افسانے کا مرکزی خیال ایک ہی ہو، اور افسانہ معشوق کی "نہیں" کی طرح کوئی دوسری بات کہہ ہی نہ سکے۔

تمہارے مجموعے میں گیارہ افسانے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مشابہت کے اعتبار سے سب کے سب نہ صرف بھائی بلکہ ہمزاد معلوم ہوتے ہیں۔ تم کہتے ہو جو ادیب اشتراکی نہیں، وہ ادیب ہی نہیں" اے دوست! ادبا پر اتنا سخت فتوے تو کسی روسی ادیب نے بھی نہیں لگایا۔ کیا تم روسی ادبا سے بھی زیادہ ترقی پسند ہو؟ اور پھر تمہارا ان ادبا کے متعلق کیا خیال ہے؟ جو بد قسمتی سے کارل مارکس کے پیدا ہونے سے پہلے پیدا ہوئے۔

میری مراد ہومر، شکسپیئر۔ میر، اور کالی داس سے ہے۔

سُرخ بہت اچھا رنگ ہے اے دوست! لیکن اس امر سے

تو تجھے بھی انکار نہ ہوگا کہ اس کے علاوہ بھی اور خوبصورت رنگ ہیں۔

جس قوس و قزح کا ذکر تو بار بار اپنے افسانوں میں کرتا ہے اس کا رنگ اگر صرف سُرخ ہوتا تو شاید تو اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتا۔ تو چاہے کچھ کہے میں تو یہ کہوں گا کہ یہ تو نہایت مبارک فال ہے کہ قلم کے آس پاس کبھی کبھی اشتراکیت ضرور رہتی ہے لیکن یہ اس سے بھی اچھا ہو گا کہ وہ اُسے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دے

تمھارا گستاخ دوست

اڈیٹر کے نام

مکرمی و محترمی!

آپ کا خط ملا۔ آپ لکھتے ہیں کہ آپ ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اسے میرے مضمون کے بغیر کیسے نکال سکتے ہیں؟۔ محترمی! یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔ متعدد رسائل نے زمانۂ ماضی اور حال میں خاص نمبر نکالے جن میں میرا کوئی مضمون نہ تھا در اصل اگر وہ میرے مضمون کا انتظار کرتے تو شاید حشر تک خاص نمبر نہ نکال سکتے۔

آپ پوچھتے ہیں کہ میں اب مضامین کیوں نہیں لکھتا؟ مکرمی! آپ ہی بتائیے کہ میں مضمون کیوں لکھوں۔ اگر خدا لگتی کہتا ہوں تو حکومت کمیونسٹ سمجھ کر جیل میں ٹھونس دیتی ہے۔ حکومت کی مدح سرائی کرتا ہوں تو ترقی پسند ادیب کان سے پکڑ کر مجلس سے باہر

نکال دیتے ہیں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہے۔ آپ ہی کہیئے کہ یہ آپ کا سادہ دل بندہ اب کہاں جائے.......؟

آپ اپنے رسالے کے لئے چند مشورے چاہتے ہیں میرا پہلا اور آخری مشورہ یہ ہے کہ رسالہ کو فوراً غیر معین عرصے کے لئے بند کر دیجئے۔ حکومت اور قوم کا جو مزاج اس وقت ہے اس کے پیش نظر آپ کو خواہ مخواہ خطرہ مول لینے کے اصول سے احتراز فرمانا چاہیے........... ان دنوں میں قومی رہنماؤں کے سوانح حیات مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔ بظاہر یہ آسان لیکن دراصل نہایت مشکل کام ہے۔

اس کو ہی لیجئے کہ مجھے ہر قومی رہنما کو شریف النسل، فرشتہ سیرت اور ولی اللہ ثابت کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات تو کافی مسخ کر دینے کے بعد بھی یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ دوسرے قومی رہنماؤں کی زندگی اتنی غیر دلچسپ واقع ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیل جانے، چرخہ کاتنے یا قوم کے لئے اشتعال انگیز نعرے ایجاد کرنے کے علاوہ انھوں نے کوئی کام کی بات کی ہی نہیں۔ اس لئے زیب داستان کے لئے متعدد قصے گھڑنا پڑتے ہیں۔ پھر بھی میں نہایت صبر سے اپنے فرض کی تکمیل کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کتاب کے شایع ہونے کے بعد فوراً مجھے کسی نہ کسی غیر ملک میں سفیر بنا کر بھیج دیا جائے گا۔

میرا آپ کو بھی مخلصانہ مشورہ ہے کہ خاص نمبر نکالنے کے

بجائے کسی قومی رہنما پہ ایک آدھ کتاب لکھ ڈالئے۔ اگر اگلے انتخابات میں کامیاب ہوگیا تو آپ کی پانچوں گھی میں ہیں۔ اگر سفیر نہیں تو کم از کم محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر آپ ضرور بنا دیے جائیں گے۔ بصورت دیگر آپ خاص نہیں چاہیے خاص الخاص نمبر نکالئے، آپ محض اڈیٹر ہی رہیں گے اور خدانخواستہ گرفتار کر لئے گئے تو شائد اڈیٹر بھی نہ رہیں۔

مخلص

اسمبلی اسپیکر کے نام

محترمی!

نہایت بے ادبی اور گستاخی سے آپ کی خدمت میں التماس کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

آپ وزراء کو ہدایت فرمائیں کہ اسمبلی میں سوالات کے جوابات دیتے وقت اپنے ادسان بجا رکھا کریں۔ مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جب سے اسمبلی معرضِ وجود میں آئی ہے کسی معقول سوال کا جواب معقول انداز میں نہیں دیا گیا۔

مثال کے طور پر پچھلے اجلاس میں جب وزیرِ معلومات سے پوچھا گیا کہ ملک میں مرغیوں کی تعداد کیا ہے تو انھوں نے شانِ بے نیازی سے فرمایا "چونکہ مرغیوں کی صحیح تعداد کا انکشاف مفادِ عامہ کے خلاف ہے۔ اس لئے میں اس سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں۔"

غضب خدا کا۔ گوشت خور عوام تو مرغی مرغی چلا رہے ہیں
اور ہمارے وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ مرغیوں کے اعداد و شمار کا علم
عوام الناس کے لئے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔
ایک اور سوال کے جواب میں " آیا گورنمنٹ کو علم ہے کہ فلاں
شہر میں طاعون سے دو ہزار آدمی مر چکے ہیں؟ اور اگر اُسے معلوم ہے
تو اس نے انھیں دفنانے کا کیا انتظام کیا ہے" " کہا گیا " گو یہ
صحیح ہے کہ واقعی دو ہزار آدمی مر چکے ہیں لیکن گورنمنٹ کو اس امر کی
کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس لئے انھیں دفنانے کا سوال پیدا ہی نہیں
ہوتا"
ایک اور ممبر نے یہ پوچھنے کی کوشش کی " کیا گورنمنٹ کو
علم ہے کہ اشیائے خورد نی کے بھاؤ برق رفتاری سے بڑھ رہے ہیں؟
اگر ہے تو گورنمنٹ ان کے بھاؤ گھٹانے کے لئے کیا عملی تدابیر اختیار
کرے گی؟ " اُسے بتایا گیا کہ گورنمنٹ کو اس بات کا علم ہے۔ لیکن
چونکہ مختلف اشیاء کے بھاؤ گورنمنٹ سے مشورہ کئے بغیر بڑھ رہے ہیں
اس لئے گورنمنٹ انھیں بڑھنے سے روکنے کے معاملے میں قاصر ہے۔"
آپ کی ضیافت طبع کے لئے میں چند اور سوالات مع جوابات
نیچے درج کر رہا ہوں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ ہمارے وزیر کس
پائے کے قانون ساز واقع ہوئے ہیں۔
سوال:۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں اسمبلی کے ان پڑھ اراکین

کے بارے میں حکومت کی پالیسی کیا ہے ؟"

جواب:۔ "حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ انھیں ان پڑھ رہنے دیا جائے۔ کیونکہ انھیں تعلیم دلوانا جمہوریت کے مفاد کے سخت منافی ہوگا۔"

سوال:۔ "وزیر خوراک دن بدن دُبلے کیوں ہوتے جا رہے ہیں ؟"

جواب:۔ "انھیں فاقہ مستوں کا ڈر کھائے جا رہا ہے"

سوال:۔ "کیا یہ صحیح ہے کہ وزرا کے سفر خرچ کا بل اُن کی تنخواہوں سے تگنا ہے ؟"

جواب:۔ "یہ غلط ہے۔ تگنا نہیں پانچ گنا ہے"

سوال:۔ گندم ؟

جواب:۔ چنا !!!

محترمی اسپیکر صاحب! یا تو کسی ممبر کو سوال کرنے کی اجازت مت دیجیے ورنہ وزرا حضرات کو سنبھالیے کہ اگر وہ اتنی بڑی تنخواہیں پانے کے باوجود اتنی ذہانت کے مالک نہیں کہ معمولی سوالوں کے جواب ٹھکانے سے دے سکیں تو انھیں فوراً اپنے عہدوں سے مستعفی ہوجانا چاہیے۔ اُمید ہے کہ آپ اس عرضداشت پر غور فرمائیں گے

خیر اندیش

فلم ڈائریکٹر کے نام

مکرمی نہ محترمی!

افسوس ہے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں اور حسب معمول عجیب وغریب فلمیں تیار کر رہے ہیں۔

سنا ہے آپ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ ہر فلم کی کہانی آپ خود لکھیں گے۔ اور اگر خود نہیں لکھیں گے، تو کہانی کا پلاٹ کسی امریکن فلم سے چرانے کے بعد اس کا حلیہ اس کامیابی سے بگاڑیں گے کہ "ہالی وڈ" کے ڈائریکٹر دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جائیں گے۔

یہ بھی سنا ہے کہ کہانی کے علاوہ مکالمے اور گانے بھی آپ خود تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ہندوستانی فلموں پر کیا گزرے گی۔ اس کا خیال کرتے ہوئے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آپ کی تازہ فلم "کھٹاک کھٹاک" دیکھی۔ ایسی دلچسپ کامیڈی تھی کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے جس خوبی سے ایک نوجوان کو خوبصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اور موخر الذکر کو اس کی جوتوں سے مرمت فرماتے ہوئے دکھایا ہے، وہ کچھ آپ کا ہی حصہ ہے اور ہاں یہ تو کہنا میں بھول گیا کہ فلم کا آخری سین فلم کی جان ہے۔ نوجوان کی چاند رفتہ رفتہ گنجی ہوتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ لیکن اس کو اس حادثے کا احساس اس طرح کرایا گیا ہے کہ حجام اس کی حجامت بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس فلم میں آپ نے قوم کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ گنجا ہو جانے کے بعد عشق کے سب امتحان ختم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جس شخص نے ہیرو کا پارٹ ادا کیا ہے وہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے کیونکہ اس کی ناک آپ کی ناک سے ملتی جلتی ہے۔ اور آپ کی ناک طوطے کی ناک سے مشابہت رکھتی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ بیشتر طوطوں کی ناک آپ کی ناک سے خوبصورت ہوگی۔ بندہ پرور ایسے شخص کو ہیرو کا پارٹ دینا جس کے چہرے پر اس قسم کی ناک ہو، افسوس ناک نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ ایسے شخص سے کوئی خاک محبت کریگا۔ میرا مطلب ہے کہ محبوبہ کو اس کی ناک کے مطالعے سے فرصت ہی کب ملے گی کہ وہ اس سے محبت کر سکے۔

گانوں کے اعتبار سے آپکی تازہ فلم آپ کی پہلی سب فلموں پر

بازی لے گئی ہے۔ خاص کر مجھے آپ کا ایک وہ گانا بہت پسند آیا
جس میں ہیرو کہتا ہے:۔

"ہائے مری سجنی ایسی پتلی جیسی پتلی سوئی"

اور ہیروئن اس خوبصورت مصرع پر اس طرح گرہ لگاتی ہے:۔

"اُوئی بالما' اُوئی ساجنا' اُوئی جالما اُوئی"

شاید آپ نے غور نہیں فرمایا۔ اس مصرع کے آخری ٹکڑے
یعنی "اُوئی جالما اوئی" میں فلم انڈسٹری زبان حال سے فریاد
کرتی ہوئی، سنائی دیتی ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے نہ ہوں اور آپ کی آخری فلم واقعی
آخری فلم ثابت ہو۔

بداندیش

غنڈے

(سنہ ۲۰۴۷ء میں ایک استاد ساتویں جماعت کے طلبا کو تاریخ کا سبق پڑھا رہا ہے۔)

بچو! آج کے سبق کا عنوان ہے "غنڈے"۔ آج میں تمھیں ان دلچسپ لوگوں کے متعلق چند نہایت دلچسپ باتیں بتاؤں گا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال ہندوستان کو آزادی ملی۔ مسلمانوں کو پاکستان ملا۔ انگریز کو شاباش ملی اور غنڈوں کو موقع ملا۔ یوں تو کہنے کو ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ضرور ملا لیکن موخرالذکر کے علاوہ باقی سب کو یہ سودا بہت مہنگا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں یہ سال غنڈوں کا سال کہلاتا ہے۔

بچو! تم یقیناً جاننا چاہتے ہو کہ غنڈے کون تھے، اور کس طرح معرضِ وجود میں آئے؟ - مورخوں میں ان دونوں سوالوں پر اختلاف رائے ہے۔ ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ "غنڈے ایک قسم کے دو پائے تھے جنھیں انسان اور انسانیت سے شدید نفرت تھی"۔ ایک دوسرے مورّخ نے انھیں "درندے" کہا ہے لیکن یہ درست نہیں۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ "جب غنڈوں کے ایک سرغنے کو درندہ کہا گیا تو اس نے بگڑ کر جواب دیا،۔

"تم مجھے درندہ کہہ کر درندوں کی توہین کر رہے ہو۔"

کہا جاتا ہے کہ غنڈے ہندوستان اور پاکستان کی ہر اکثریت سے تعلق رکھتے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سبھی طرح اور سبھی قماش کے غنڈے تھے۔

یہ بات واقعی عجیب ہے کہ ان دونوں ممالک کی اقلیتیں کوشش کے باوجود کوئی قابلِ ذکر غنڈہ پیدا نہ کرسکیں۔ چنانچہ کسی کتاب میں عیسائی، پارسی، اینگلو انڈین غنڈے کا ذکر نہیں آیا۔

غنڈے معرضِ وجود میں کس طرح آئے؟ اس سوال کا جواب دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ تحقیق اور چھان بین کے باوجود مورخین کسی فیصلے پر نہیں پہونچ سکے۔ مشہور جغرافی مورخ پاتلے کا خیال ہے کہ غنڈے اس لئے پیدا ہوئے۔ کیونکہ بمبئی کے ایک دولتمند مسلمان کو جس کا پیشہ وکالت اور تفریح سیاست تھی، ایک دفعہ

الہام ہوا کہ ایک ماں کے جائے، سگے بھائی ہونے کے باوجود سگے بھائی نہیں ہیں"۔ لیکن ایک مسلمان مورخ قائم خاں کی رائے میں یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"غنڈے محض اس لئے معرض وجود میں آئے۔ کیونکہ ایک جوشیلے سردار نے بیک وقت اپنی لمبی ڈاڑھی اور لمبی تلوار کو جنبش میں لاتے ہوئے کہا تھا کہ میں ملیچھوں کو گنڈی کوتل سے پرے پہنچا کر دم لوں گا بشرطیکہ انھوں نے مجھے دم لینے دیا۔"

اس وجہ جواز کو لغو گردانتے ہوئے ایک سکھ مورخ تلوارا سنگھ لکھتا ہے:۔

"غنڈے کبھی منظر عام پر نہ آتے اگر ایک نیم انگریز۔ نیم مسلمان منبر پر کھڑے ہوکر چلا کر نہ کہتا "میں ہلاکو کا بیٹا ہوں مجھے فخر ہے کہ میرا سلسلۂ نسب چنگیز خاں سے ملتا ہے"

بچو! بات دراصل یہ ہے کہ تاریخ اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مختلف مورخوں نے جو وجوہ بیان کی ہیں درست ہیں۔ پھر بھی دماغ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اتنی بھاری تعداد اور اتنے قلیل عرصے میں غنڈے کیسے پیدا ہوگئے حالانکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ان کی تعداد برائے نام تھی۔

میں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں کہ غنڈے ہر بڑی قوم سے تعلق رکھتے تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا ہر بڑے مذہب سے بھی

کوئی تعلق تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندو مسلم سکھ کے امتیاز کے باوجود غنڈے صرف ایک مذہب پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اس مذہب کا نام مورخین کو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ اتنا پتہ ضرور چلا ہے کہ اس مذہب کے صرف تین اصول تھے جنھیں ایک مورخ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

(۱) چونکہ آدمی کو انسان ہونا میسّر نہیں۔ اس لئے ہم انسان بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔

(۲) "ابلیس" ہمارا خدا ہے اور ہمارا ایمان کچھ بھی نہیں۔

(۳) ہمیں اپنے ہم سائے سے نفرت مگر اس کی بیوی سے محبت ہے

بچو! غنڈوں کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ میں صرف چیدہ چیدہ کا ذکر کروں گا۔ انھوں نے خوبصورت شہروں کو جلا کر راکھ کر دیا اور ان کی راکھ پر عالیشان کھنڈرات تعمیر کئے۔ بڑے بڑے شہروں میں قبرستان اور شمشان تیار کرائے جن کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ان میں لاکھوں آدمی آرام کر سکتے تھے۔ فاقہ زدہ گدھوں، کتوں اور کوؤں کی ضیافت کے لئے کشتوں کے پشتے لگائے۔

قرآن کی ہر آیت اور وید کے ہر منتر کی بڑی خوبی، چابکدستی اور کامیابی سے توہین کی۔

بچو! تم پوچھو گے کہ اس اثنا میں جب غنڈے یہ عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے، حکومت کیا کر رہی تھی؟ تمھارا سوال بجا ہے لیکن

تاریخ اس سوال پر روشنی ڈالنے سے حسب معمول معذور ہے مورخین (جیسا کہ ان کی عادت ہے) مختلف وجوہ بیان کرتے ہیں۔ جن کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت تعمیری سرگرمیوں میں اس قدر مصروف تھی کہ اُسے کسی اور کام کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی۔ حکومت کو لمبے لمبے بیانات شایع کرنے ہوتے تھے اور ارباب حکومت کا بہت سا وقت ان بیانات کے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو غنڈے نے ہلاک کر دیا تھا ان کی تجہیز و تکفین کا کام بھی حکومت کے ذمّے تھا۔ زخمیوں اور مقتولوں کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت نے لے رکھی تھی۔ ان حالات میں حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ غنڈوں کو منمانی کرنے سے روکتی سراسر ناواجب تھا۔

بچو! اب تم شاید یہ پوچھنا چاہتے ہو" ناکہ حکومت ایک حد تک مجبور تھی لیکن شرفا تو مجبور نہ تھے۔ انھوں نے غنڈوں کے خلاف کیوں محاذ قائم نہ کیا۔؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے۔ اوّل تو یہ کہنا بھی بہت بڑا مبالغہ ہے کہ اس وقت ان دونوں ممالک میں شرفا کا بھی وجود تھا۔ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ تھا، تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تعداد برائے نام تھی۔ اور ان میں سے بیشتر ایک خطرناک وبا میں مبتلا تھے جس کا نام کئی مورخین " اخلاقی فالج" بتلاتے ہیں۔

تم کہو گے کہ کیا ہندوستان اور پاکستان میں اس نوعیت کا قحط الرجال تھا کہ ایک شخص نے بھی غنڈوں کے خلاف آواز بلند نہ کی میں اس ضمن میں اپنی ذاتی رائے بتانے کی بجائے بلند پایہ بنگالی مورخ بنگلا آنند بھٹا چاریہ کی مشہور تصنیف "تاریخ غنڈاں" سے ایک صفحہ پڑھ کر سناؤں گا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"اس میں شک کی ذرا بھر گنجائش نہیں کہ غنڈوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ حکومت خاموش اور شرفا مبہوت تھے لیکن اس قبر کی سی خاموشی میں ایک آواز ندائے صحرا کی مانند فضاؤں میں گنگناتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ یہ ایک بوڑھے درویش کی صدا تھی وہ اپنی دھیمی اور میٹھی آواز میں بار بار تلقین کرتا رہا کہ سگے بھائی آخر سگے بھائی ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انھیں جدا نہیں کر سکتی۔ مگر اس کی چیخ و پکار کا غنڈوں پر کچھ اثر نہ ہوا اور آخر جب اس نے اپنی آواز کو دھیما کرنے کی بجائے تیز کر دیا تو غنڈوں کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔"

بچو! کہتے ہیں کہ موسم سرما کی ایک شام کو ایک دیوانے غنڈے نے جوش میں آکر اس بوڑھے درویش کا کام تمام کر دیا۔ وہ درویش تاریخ عالم میں "شہید اعظم" کے لقب سے مشہور رہوا۔ اور اس کی سمادھ جمنا

کے کنارے ہئی۔ اس سمادھ پر پوس کے مہینے میں ہر سال میلہ لگتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان سے ہزاروں یاتری درویش کی قبر پر اخوت اور محبت کے چراغ جلاتے ہیں۔

اس درویش نے اپنی زندگی میں کئی چمتکار دکھائے تھے۔ لیکن اس نے اپنا سب سے بڑا معجزہ اپنی شہادت کے بعد دکھایا۔ اور وہ یہ تھا کہ اس کی شہادت کے چند گھنٹوں کے بعد غنڈوں اور غنڈہ۔ اِزم کا خاتمہ ہوگیا۔

بچو! یہ اسی بوڑھے درویش کی قربانی کا اعجاز ہے کہ آج ہندوستان اور پاکستان کی مملکتیں قائم ہیں۔ اور ان میں غنڈوں کی بجائے مُہذّب اور شریف ہندوستانی اور پاکستانی امن کا سانس لے رہے ہیں۔

زندہ باد

(افریقہ کے جنگل میں ایک پڑھا لکھا حبشی اپنے ان پڑھ ساتھیوں کو جادو کی لالٹین سے چند تصاویر دکھا رہا ہے۔)

تمہید۔ دوستو! ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم وحشی واقع ہوئے ہیں۔ وحشت ہمارا پیدائشی حق ہی نہیں بلکہ عزیز ترین سرمایہ ہے۔ ہماری کوئی نئی یا پرانی تہذیب نہیں۔ ہم جنگل کی آغوش میں پروان چڑھے اور ہماری روحوں میں بھیڑیوں، چیتوں اور خونخوار جنگلی جانوروں کی عادات سرایت کر گئیں۔ ہم اپنے آپ کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن بدل نہیں سکتے۔ شاید قدرت کا یہی تقاضا ہے کہ ہم ازل سے لے کر ابد تک وحشی رہیں۔ تہذیب و تمدن کی ضیا و چینی کے باوجود ہم آج بھی وہی ہیں جو ہمارے آبا و اجداد تھے۔

میرا روئے سخن ان خونخوار بندروں اور لنگوروں کی طرف ہے جن کی ہم بلاشبہ اولاد ہیں۔ لیکن خدا کا لاکھ شکر ہے کہ اگرچہ ہم وحشی ہیں لیکن کرۂ ارض پر ایسے ممالک بھی موجود ہیں جنھیں تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ جہاں مہذّب انسان رہتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے پیغمبر اور اوتار پیدا ہوئے۔ آج میں تمھیں ان ہی ممالک کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔

(پہلی تصویر دکھاتے ہوئے) حضرات! ذرا اس تصویر کو غور سے دیکھیئے۔ شاید آپ سمجھتے ہیں یہ تہذیب کا جنازہ ہے۔ حضرات! آپ غلطی پر ہیں۔ یہ صرف برہنہ عورتوں کا ایک جلوس ہے جو آزادی کی خوشی میں بڑے بڑے شہروں میں نکالا گیا۔ جلوس کے آگے چند مادر زاد ننگے مرد ناچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھیں غایت درجہ مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ عورتوں کے چہرے البتہ خوشی کے جذبات سے عاری ہیں۔ یہ جلوس کہاں جا رہا ہے؟ جہنم میں؟ نہیں حضرات! یہ جلوس مارکیٹ کی طرف بڑھ رہا ہے، وہاں ان عورتوں کا نیلام کیا جاوے گا۔ اس تصویر سے ہم کیا روحانی سبق حاصل کر سکتے ہیں؟ حضرات! یہ تو میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ البتہ اس میں کوئی نہ کوئی روحانی نکتہ ضرور ہوگا جو ہم وحشیوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اچھا چھوڑیے یہ قصّہ اب دوسری تصویر دیکھئے۔

(دوسری تصویر دکھاتے ہوئے)۔ یہ رہی دوسری تصویر۔ میں!

آپ نے آنکھیں کیوں بند کرلیں ؟ ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ یہ صرف ایک حاملہ عورت کی تصویر ہے جس کا پیٹ ایک تیز ہتھیار سے شق کیا جارہا ہے۔ کیا یہ کوئی نئے قسم کا اپریشن ہے ؟ نہیں نہیں حضرات ! یہ ایک نئی طرح کی تفریح ہے۔ پیٹ شق کرکے کیا کریں گے ؟ مردہ بچے کو نیزے میں پرو کر گھمائیں گے۔ لیکن اس انوکھے کھیل کا مطلب ؟ مطلب یہ کہ تہذیب اس رفتار سے ترقی کر رہی ہے کہ تہذیب یافتہ اقوام کو دل بہلانے کے لئے نت نئے کھیل ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔

(تیسری تصویر دکھاتے ہوئے) یہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے۔ جسے شعلوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اتنے شعلے کیسے روشن ہوگئے حضرات ! آپ بھی بڑے سادہ لوح ہیں۔ آگ لگانے سے پہلے احتیاطاً اس عمارت پر پٹرول چھڑک دیا گیا تھا۔ یہ دیکھئے ! سب سے اونچی منزل میں چند عورتیں اور بچے چیختے اور کراہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آگ بجھانے والا انجن کیوں نہیں آیا ؟ آیا تو تھا۔ لیکن آگ بجھانے والوں کو پتھروں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ شعلوں میں گھرے ہوئے بچے اور عورتیں کیسے بچائی جائیں گی ؟ حضرات ! ان کے بچ کر نکلنے کی ہر راہ مسدود ہے انھیں آگ کے شعلوں سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ گلی میں کھڑے ہوئے ہجوم میں سے تین چار اشخاص گولیوں کا نشانہ بنا دیں گے تو یہ سب مرجائیں گے ؟ مر تو ضرور جائیں گے لیکن شعلوں میں زندہ جھلسا جانے سے بچ جائیں گے۔ عمارت کو آگ کس نے لگائی ؟

انھیں لوگوں کے ہمسایوں نے۔ کیوں؟ کیونکہ جن مذاہب کے یہ پیرو ہیں، ان میں بار بار یہ تلقین کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے ہمسایوں سے محبت کرو۔

(چوتھی تصویر دکھاتے ہوئے) حضرات! اس تصویر میں ایک نہایت دردناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ ہاں ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔ ان سب لوگوں کو باری باری ذبح کیا جا رہا ہے۔ کیا ذبح کرنے والے آدم خور ہیں؟ نہیں حضرات! آدم خور تو صرف ہمارے بدقسمت ملک میں رہتے ہیں تو پھر اس قتلِ عام کا مقصد؟ حضرات! یہ تقریب بھی جشنِ آزادی کے سلسلے میں ہے۔ ان لوگوں کو قتل کرنے کے بعد کھیتوں اور میدانوں میں پھینک دیا جائے گا۔ تاکہ بھوکے کوّے گدھ اور کتے پیٹ بھر کر گوشت نوچ سکیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور کمزور بوڑھوں کو کیوں ذبح کیا جا رہا ہے؟ حضرات! آپ بھی ایک ہوتق ہیں۔ کیا ایک چھوٹے بچے یا بوڑھے کی لاش ایک بھوکے گدھ کی شکم پُری نہیں کر سکتی؟ عورتوں کو قتل نہیں کرنا چاہیئے تھا؟ آپ کا اعتراض فضول ہے۔ جشنِ آزادی کی تقریبوں میں۔ مرد اور عورت میں تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

(پانچویں تصویر دکھاتے ہوئے) جی ہاں یہ ایک ساکن ریلوے گاڑی کی تصویر ہے۔ ہجوم ڈبوں سے مسافروں کو کیوں گھسیٹ رہا ہے؟ ذرا دماغ پر زور ڈالیئے۔ آپ نہیں بتا سکتے۔ ہجوم چاہتا ہے کہ ان مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود پر جلد سے جلد پہنچا دیا جائے

بھلا ریل گاڑی سے کہیں سفرِ حیات کٹتا ہے ! تو کیا یہ سب مسافر منزلِ مقصود تک پہنچا دیے جائیں گے ۔ سب نہیں ۔ نوجوان اور خوبصورت عورتوں کو ابھی چند منزلیں اور طے کرنی پڑیں گی ۔

(چھٹی تصویر دکھاتے ہوئے) یہ ایک خانہ بدوش لوگوں کا قافلہ ہے ۔ کتنا لمبا ہے ؟ یہی کوئی پندرہ سولہ میل ۔ ہاں اور سامنے سے ایک اور قافلے کو آتے ہوئے بھی دیکھیے ۔

یہ لوگ اداس اُداس کیوں دکھائی دیتے ہیں ۔ حضرات آزادی کی خوشی میں وہ اس قدر ہنسے ہیں کہ اُن کی آنکھیں بھر آئی ہیں ۔ یہ کہاں جا رہے ہیں ؟ ایک ملک سے دوسرے ملک تک ۔ مگر کیوں ؟ کیونکہ ان کے رہنماؤں کا ارشاد یہی ہے کہ اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت اور دمکتے ہوئے گھروں کو چھوڑ دو ۔ ان لوگوں کو اتنی کڑی سزا کیوں دی گئی ؟ یہ تو ان کے رہنماؤں سے پوچھیے ۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اس میں بھی اگر کوئی روحانی حکمت نہیں تو سیاسی نکتہ ضرور ہوگا ۔ یہ قافلے کتنے دنوں سے چل رہے ہیں ؟ ان کی منزل کہاں ہے ؟ حضرات ! ان سوالوں کا جواب تو شاید قافلے والے بھی نہیں جانتے ۔

(آخری تصویر دکھاتے ہوئے) لیجیے حضرات ! یہ آخری تصویر ہے ۔ پیش منظر میں آپ کو ایک مینار نظر آتا ہے ، اسے غور سے دیکھیے ۔ یہ معمولی مینار نہیں ۔ اس کی تعمیر میں دس لاکھ انسانی کھوپڑیاں استعمال کی گئی ہیں ۔ بلندی کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے اونچا مینار

ہے۔ قطب مینار سے سوگنا اونچا۔ بابر کے انسانی سروں سے بنائے گئے روایتی مینار سے کئی ہزار گنا اونچا۔ اس مینار کی تعمیر میں ہزاروں معماروں کا ہاتھ ہے، انھوں نے روز و شب کی مسلسل مشقت اور جاں سوزی سے مینار ایک سال کے عرصے میں تیار کیا۔ مینار کے اردگرد میلوں تک بکھرے ہوئے لاکھوں کٹے ہوئے دھڑ، ٹانگیں اور پستان نظر آتے ہیں۔ یہ مینار کے نئے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ ذرا دیکھیئے منار پہ کون سے الفاظ کندہ ہیں۔ آپ نہیں پڑھ سکتے۔ لیجیے میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ ہاں پڑھنے سے پہلے میں یہ عرض کردوں کہ یہ الفاظ خون سے لکھے گئے ہیں تاکہ ہمیشہ کے لئے سند رہیں۔ تو سُنیئے ان الفاظ کا مطلب صرف یہ ہے۔

مینارِ آزادی
اگست سنہ ۱۹۴۷ء

ہندو مسلم
زندہ باد

تصویریں ختم ہوئیں۔ آپ شوق سے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں میں دعا کروں گا کہ آپ ان تصاویر سے عبرت حاصل کریں اور اپنی قومی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنائیں۔

گدھا نائٹ

چار ملنگوں کی داستان

پہلا ملنگ

صاحبو! چرخِ کج رفتار اور فلکِ ناہنجار نے مجھ نیم جاں، ہیچمداں پر ایسا اوچھا وار کیا کہ بیک وقت دل و جگر کو ہزار مصیبتوں میں گرفتار کیا۔

بڑے آرام اور چین سے زندگی گزر رہی تھی۔ ہر روز روزِ عید تھا۔ ہر شب شبِ برات، کہ یک لخت ۱۵ اگست کو یہ حکم ملا کہ لاہور والے دہلی اور دہلی والے لاہور چلے جائیں"۔ کیا کہ بھاگ دہلی پہونچا یہاں آکر دیکھتا ہوں کہ کانگریسیوں کا ہجوم ہے کہ جس کی سارے شہر میں دھوم ہے" مہاتما گاندھی کی جے" اور" آزاد ہندوستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی ہے۔ میخانے بند ہیں لیکن قہوہ خانوں میں وہ بھیڑ ہے کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ قہوہ نوشش

جشنِ آزادی کے سلسلے میں قہوہ پی پی کر بے حال ہو رہے ہیں۔
بھیڑ بھاڑ کو چیرتا، ان کے قریب پہونچا اور یہ الفاظ زبان پر لایا
"صاحبو! میں ایک غریب الوطن، مفلوک الحال پناہ گزین
ہوں خدا کے واسطے میری مدد کرو۔"
اُن میں سے ایک ستم ظریف بولا، "غریب الوطن ہو تو کسی درخت
کی گھنی چھاؤں میں بیٹھکر آرام کرو اور مفلوک الحال ہو تو ضرور راستے
سے بھٹک گئے ہو۔ یہ پناہ گزینوں کا کیمپ نہیں قہوہ خانہ ہے"۔
یہ ٹکا سا جواب سُن کر وہاں سے ایک کیمپ کا رُخ کیا جہاں
تین ماہ زمین پر سوتا۔ بڑی پیتا۔ جو اور گیہوں کے ملے جُلے آٹے کی
روٹی کھاتا اور خداوندکریم کا شکر بجا لاتا رہا۔ آخر جب کیمپ والوں
نے ہر روز یہ پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیا کہ میرے خاندان کے کتنے
افراد ہیں۔ میرے گھر سے کے عورتیں اغوا کی گئیں۔ اور مجھے بوسیدہ
رضائی قبول کرنے میں کیا عذر ہے تو کیمپ کو خیرباد کہہ کر پھر شہر میں آگیا
ارادہ تھا کہ ایک آدھ کمرا مل جائے تو زندگی کے باقی دن کانگریس اور
مسلم لیگ کی مدح سرائی میں بسر کروں کہ جنھوں نے ہندوستان اور
پاکستان بنائے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شہر کا کونہ کونہ چھان
مارا۔ ہر واقف ناواقف سے ملا۔ سڑکوں پر مہینوں لڑھکتا پھرا۔
لیکن مکان نہ ملا۔ منت و سماجت۔ خوشامد، دھمکی، مختصر یہ کہ ہر
حربہ استعمال کیا لیکن بے سود۔ اپنی تباہ حالی کا واسطہ دیا۔ خدا اور

جہنم کے قہر سے لوگوں کو ڈرایا۔ دھمکایا مگر کسی مالک مکان کا دل نہ پسیجا جہاں بھی گیا وہاں سے بے نیل و مرام پھرا۔ کسی نے پگڑی طلب کی تو کسی نے سارے کپڑے اتار لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دس دن پلیٹ فارم پر کاٹے، پانچ دن ایک پُل کے نیچے سوتا رہا۔ جب مکان ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پہنچا اور ساری رات رو رو کر فریاد کی کہ اے حضرت یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں کہ اِس جانب بھی ہے پگڑی اور اُس جانب بھی ہے پگڑی۔

جب روتے روتے آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تو دیکھا کہ مشرق میں سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اٹھا اور ایک بار پھر کمر باندھ کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ کوچہ چڑیا راں میں ایک کباڑی سے ملاقات ہوئی، کہنے کو تو وہ کباڑی تھا لیکن خضر صورت۔ فرشتہ سیرت۔ چہرے پر وہ جلال کہ یقین نہ آیا کہ ایسا باکمال بزرگ ٹوٹی پھوٹی لالٹینیں اور پھٹی پرانی کتابیں فروخت کرتا ہے۔ اس سے مصافحہ کرنے کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ اس نے اپنی تین انچ لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چار دفعہ لاحول پڑھا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا متعدد پیچ دار گلیوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا وہ مجھے اس غسلخانے میں لے آیا۔ جس میں آپ حضرات اس وقت تشریف فرما ہیں اور نہایت رقت آمیز لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا:۔

"نوجوان! جی چاہتا ہے کہ تمہیں گورنر جنرل کی کوٹھی بخش دوں مگر افسوس کہ اس وقت میرے پاس اس غسلخانے کے علاوہ دوسری جگہ نہیں۔ اس کا پچھتر روپیہ ماہوار کرایہ ہو گا، اگر تو پناہ گزین نہ ہوتا تو میں تجھ سے سو روپئے ماہانہ طلب کرتا۔ لیکن جا چھوڑ دیا تجھ کو گناہگار سمجھ کر"

چنانچہ اس دن سے صاحبو! اس غسلخانے میں مقیم ہوں۔ آپ نے جب سر راہ دریافت کیا تھا کہ میرا دولت خانہ کہاں ہے اور میں نے جواب دیا تھا "کہ غسلخانہ کوچہ چڑیا ران میں ہے تو آپ کو یقین نہیں آیا تھا۔ اب آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ میں نے کس حد تک جھوٹ بولا تھا۔

(۲)

دوسرا ملنگ

صاحبو! میں کیا کہوں کہ میں کون ہوں یا کیا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول ظفر "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں، مشت غبار البتہ ضرور کبھی تھا لیکن آج کل تو صرف مشت استخوان ہوں۔ گردش دوران نے مجھے بھی دہلی لا پھینکا" لیکن "دہلی کہ ایک شہر ہے عالم میں انتخاب" مجھے راس نہ آیا۔

ملازمت اس لئے نہ ملی کہ کسی کانگرنسی لیڈر سے سرسری ملاقات

بھی نہ تھی۔ دو ایک انٹرویوز میں بلا یا ضرور گیا۔ مگر اس سوال کا کیا جواب کہ سالم ہندوستان میں میں کتنی بار جیل گیا۔ اور قیدِ ہند کے دوران میں میں نے کتنے سوگز سوت کاتا۔

یہ درست ہے کہ ایک دفعہ ہمت سے کام لے کر میں نے ضرور کہا کہ میرا بڑا بھائی ایک بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔ لیکن جیب بورڈ کے صدر نے پوچھا "کس سنیہ آگرہ کے سلسلے میں؟" اور میں نے جواب دیا:۔ "جیب کترنے کے جرم میں" تو صاحبو! مجھے دفتر سے دھکّے مار مار کر نکال دیا گیا۔ کچھ دن عجیب ششں و پنج میں رہا۔ بارے کل ایک ملازمت دستیاب ہوئی اور میں ایک بھٹیارن کے ہاں بھاڑ جھونکنے پر ملازم ہو گیا۔ شام کے وقت بھاڑ جھونکتا ہوں اور دوپہر کے وقت ان دفتروں کا طواف کرتا ہوں۔ جہاں اُمیدوار ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں انٹرویو کے لئے بلائے جاتے ہیں۔

ایک ٹوکری میں کھدر کی ٹوپیاں رکھ کر "طلسمی ٹوپی" "طلسمی ٹوپی" کی صدا لگاتا ہوں اگر کوئی اُمیدوار ناسمجھی کے باعث پوچھ بیٹھتا ہے کہ میں اسے طلسمی ٹوپی کیوں کہتا ہوں۔ تو نہایت پیار سے اسے سمجھاتا ہوں کہ "برخوردار جب تک اسے سر پہ نہیں پہنو گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ تمھیں بہشت مل جائے لیکن سرکاری ملازمت نہیں ملنے کی۔ اسے پہن لو اور پھر خدا کی شان دیکھو۔ اگر انٹرویو کے وقت بورڈ کے تمام ممبر اندھے نہ ہو جائیں تو میرا نام ہُدہُد سلیمانی نہیں۔"

ہاں توصاحبو۔ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ کہ رات کے وقت سوتا کہاں ہوں۔ اس عظیم الشان شہر میں بھلا مجھ ایسے قلمدزر کو کون سی جگہ مل سکتی ہے۔ گرمی کے موسم میں تو سڑکوں کی پٹریوں پر سو رہا ہوں اور موسم سرما میں خون کو منجمد کر دینے والی سردی سے مجھے کہیں امان ملی ہے تو وہ ایک حلوائی کی بھٹی ہے۔ رات کے وقت اس میں ٹانگیں سکیڑ کر پڑ رہتا ہوں، اور دعا دیتا ہوں، اُن بزرگانِ ملّت کو کہ جن کی سعی سے ہمیں آزادی جیسی نعمت ملی۔

(۳)

تیسرا ملنگ

صاحبو! اگر آپ کے پاس جگر ہے تو ایک لحظہ کے لئے تھام لیجئے کیونکہ میری رام کہانی ایک قصہ طولانی ہے۔ میں ان بدقسمت افراد میں سے ہوں جو دہلی خود نہیں آئے بلکہ لائے گئے۔ ۲۰ر اگست کو ایک مال گاڑی میں لاد کر مجھے لاہور سے دہلی پہنچا یا گیا۔ جب لاہور کہ مجھے جان سے عزیز تھا۔ چھوٹ گیا تو میں نے ؎ مسجد ہو مدرسہ ہو یا خانقاہ ہو" کے مصداق دہلی کو اپنا گھر سمجھا۔ ارادہ تھا کہ یہاں سے ایک اُردو رسالہ نکالوں کہ جس کی سج دھج دیکھ کر کہ مردمہ مرحبا پکار اٹھیں لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس خواہش پر اوس پڑ گئی چھ ماہ تو ڈیکلریشن نہ ملا۔ جب ڈیکلریشن ملا تو دہلی میں کاغذ نایاب

ہوگیا۔ کاغذ ملا تو پریس نہ ملا۔ غرضیکہ ہمیشہ ایک چیز ملتی رہی اور دوسری کا تعاقب کرتا رہا۔ اس اثنا میں اثاثہ ختم ہوگیا۔ اب حیران و پریشان تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ ایک دن خودکشی کا منصوبہ باندھ کر ایک موٹر بس کے آگے لیٹ گیا۔ لیکن شامتِ اعمال سے ڈرائیور نے عین وقت پر بریک دبا دی اور بس سے اتر کر یوں گویا ہوا :-

"اے نوجوان! تیرا کیا ارادہ ہے اور تو خودکشی کرنے پر کیوں آمادہ ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ دنیا کتنی حسین ہے! اور یہ آزاد ہندوستان کی سرزمین ہے۔"

میں نے جواب میں ایک مصرع پڑھا ع

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید

ڈرائیور کی سمجھ میں یہ مصرع نہ آیا اور اس نے مجھے نثر میں بات کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"میں بے گھر اور بے کار ہوں۔"

ڈرائیور نے ہنس کر کہا:- "اے کمبخت دہلی میں کون بے گھر اور بے کار نہیں۔" یہ کہتے ہی اس نے بس اسٹارٹ کی اور ہوا ہوگیا۔

ایک اتوار کو یوں ہی سیر کرتا قطب مینار کو جانے والی سڑک پر جا نکلا۔ دیکھا کہ اس سڑک کے دائیں بائیں ہزاروں اُجڑے

ہوئے مقبرے اور مسجدیں ہیں۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سمادھ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کہ گنبد کی طرف سے آواز آئی "اے خدا کے نیک بندے مکان کی تلاش میں کیوں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اگر تجھے کوئی جگہ نہیں ملی۔ تو مایوس نہ ہو۔ کسی مقبرے کو آباد کر"

چنانچہ صاجو! میں اس رات غلام فیروز کے مقبرے میں کہ جو فرخ سیر کا وفادار حبشی ہوا کرتا تھا چلا گیا۔ پہلی رات جو اس مقبرے میں میرا حشر ہوا۔ اس کو بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

کوئی ایک بجے رات کا عمل تھا۔ گھپ اندھیرا اور ہو کا عالم۔ صاجو! یک لخت غلام فیروز کا بھوت اپنی قبر میں سے نکلا اور چیخ کر میرے گلے سے لپٹ گیا۔ میں نے اوسان قائم رکھتے ہوئے کہا۔ "میاں غلام فیروز! مجھے ڈرانے کی کوشش مت کیجئے۔ میں پنجابی ہوں"۔ غلام فیروز کے بھوت نے فارسی زبان میں مجھے چند گالیاں دیں لیکن چونکہ بندہ فارسی زبان سے قطعاً ناواقف ہے اس لئے مجھے بالکل غصہ نہ آیا۔ جب بھوت گالیاں دیتے دیتے تھک گیا تو میں نے نہایت انکساری سے کہا۔ "بندۂ خدا تم اتنے سالوں سے اس مقبرے میں تنہا سو رہے ہو۔ کیا تم اس مسلسل تنہائی سے اکتائے نہیں؟ تمھیں تو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اتنی مدت کے بعد ایک انسان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا"

لیکن بھوت کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی۔ اس نے اشارا کیا۔ کہ میں مقبرے سے باہر چلا جاؤں۔ خیر اس رات تو میں وہاں سے

چلا آیا۔ لیکن آخر پنجابی ہوں۔ اتنی آسانی سے ایک بھوت سے چاہے وہ فرخ سیر کے وفادار حبشی کا بھوت ہی کیوں نہ ہو، مغلوب ہوجانا۔ میری غیرت نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک آوارہ کُتّے کو کہ جو میری طرح گلیوں میں بھٹک رہا تھا، پکڑ کر اُس مقبرے میں لے گیا۔ ایک بجے جب بھوت پھر قبر سے باہر نکلا تو میں نے کُتّے کو اشارا کیا کہ اے جانِ دوست! حقِ نمک ادا کرنے کا موقع آپہونچا کتّے نے غرّا کر جو بھوت کی گردن ناپی۔ تو وہ دبک کر قبر میں غائب ہوگیا۔ بس تو صاحبو! اسی دن سے میں اور وہ کتا نہایت اطمینان سے اس مقبرے میں رہتے ہیں اور ہر روز میاں غلام فیروز کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہیں، کہ اگر نہ مرتا تو اس وقت ہم دونوں دہلی کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔

(۴)

چوتھا ملنگ

صاحبو! انقلابات ہیں زمانے کے" کسے خبر تھی کہ میں کہ جس کے آگے بڑے بڑے رؤسا پانی بھرتے تھے اور جسے مہرو ماہ سلام کرتے تھے، اس حالت کو پہونچوں گا کہ میرے پاس پہننے کو پھٹی ہوئی جوتی اور رہنے کو تنگ و تاریک کوٹھڑی بھی نہ ہوگی۔ میں جب دہلی میں آیا تو میری جیب میں صرف ایک صد روپیہ تھا۔

کیمپ میں اس لئے نہ گیا کہ خاندانی وجاہت نے گوارا نہ کیا۔ ایک درخت کے نیچے بسیرا کیا اور چنے چبا چبا کر پیٹ کا دوزخ بھرتا رہا جب متواتر ایک ہفتہ چنے چباتے چباتے دانتوں میں درد ہونے لگا تو ایک دندان ساز کی دوکان کا رُخ کیا۔ جس نے ایک ڈاڑھ نکال کر مجھ سے پانچ روپے وصول کئے اور نصیحت کی۔ "کہ اگر باقی دانتوں کی خیریت مطلوب ہے تو عمر بھر چنے مت چبانا۔ چاول کی تلاش میں ایک دوکان سے دوسری تک بھٹکا لیکن چاول دستیاب نہ ہوئے ایک بلیاک مارکیٹیر سے ملا۔ جس نے کمال مہربانی سے میری حالتِ زار پر ترس کھاکر دس روپے فی سیر کے بھاؤ پر دو سیر چاول عطا کئے اب میرے پاس صرف پچھتر روپے رہ گئے تھے۔ سوچا کہ ان سے کوئی دھندا چلاؤں۔

چنانچہ لال قلعہ کے باہر ایک ٹوکری میں لال چقندر۔ ٹماٹر اور سرخ مرچیں رکھ کر بیچنے لگا۔ خیال تھا کہ اس طرح جو چار پیسے کماؤں گا ان سے گزر ہو جائے گی۔ لیکن افسوس یہ خیال غلط نکلا۔ ان ہی دنوں دہلی میں کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چنانچہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پولیس افسر لال وردی پہنے میرے سر پر کھڑا ہے اور ملک الموت کی طرح لال لال آنکھیں دکھا رہا ہے۔ میں نے نہایت متانت سے پوچھا "آپ کو ٹماٹر چاہئیں یا چقندر ؟" اس نے آگے بڑھ کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی اور ایک

طنزیہ قہقہے کے ساتھ کہا " بیٹا میں تم کمیونسٹوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

میں نے چیخ کر کہا۔ "پہلے یہ تو بتائیے کہ مجھ سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے؟"

اُس نے میرے سوال کا کچھ جواب نہ دیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے پولیس اسٹیشن میں لے گیا۔ وہاں پہونچ کر طرح طرح کی تہمتیں تراشنے لگا۔ کہ "میں صرف لال سبزیاں کیوں فروخت کرتا ہوں؟" "مجھے روس سے کتنا وظیفہ ملتا ہے؟" "اور میں حکومت کے خلاف سازش کی کھچڑی کس جگہ بیٹھ کر پکاتا ہوں؟"

میں یہ لغو اور بے بنیاد الزامات سُن کر بھونچکا رہ گیا ہر چند کہ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ روس یا کمیونسٹوں سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسے اعتبار نہ آیا۔

صاحبو! اس نے میرا چالان مکمل کر کے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا۔

خوش قسمتی سے مجسٹریٹ سمجھدار واقع ہوا تھا۔ اس نے جب تمام واقعے کی تفصیل سُنی تو مسکرا کر کہنے لگا:۔

" ہر لال چیز کمیونزم نہیں۔ نوجوان! تم باعزت بری کئے جاتے ہو۔"

صاحبو! بری تو میں ہو گیا لیکن اس دن سے میں نے قسم کھائی کہ لال سبزی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے کہ اگر آپ سلامتی چاہتے ہیں تو لال چیزوں سے بچ کر رہیئے کہ آنجہانی میر فرما گئے ہیں ۔ ع ۔

"دِلّی نہیں، یہ دِلّی ہے"

پروفیسر دانش

پروفیسر دانش اپنے کتب خانے میں کہ جو بیک وقت اُن کا کتب خانہ اور غسلخانہ تھا، دیوان غالب پر لکھی ہوئی ایک شرح کا مطالعہ کر رہے تھے۔ شارح نے ایک نہیں متعدد اشعار کا مطلب اس انداز میں بیان کیا تھا کہ پروفیسر دانش کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ معاً ان کی نظر اس شعر پر پڑی ؂

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شارح نے اس کی توضیح حسب ذیل الفاظ میں کی تھی۔
"ہمیں ان شارحین سے عقل و دانش کی توقع ہے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ عقل و دانش کس بلا کا نام ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں مرزا غالب نے اُن شارحین پر چوٹ کی ہے جنھوں نے خاکسار سے پہلے دیوانِ غالب پر شرحیں لکھیں"

شعر کی یہ تفسیر پڑھ کر پروفیسر دانش بھونچکا رہ گئے۔ اپنی گنجی چاند پر دو ایک بار ہاتھ پھیرا۔ لاحول پڑھا اور کتاب بند کرکے دانت پیسنے لگے دانت پیسنا پروفیسر دانش کا محبوب شغل تھا۔ انھیں جب کوئی اور کام نہ ہوتا تو دانت پیسنا شروع کر دیتے۔ پروفیسر دانش کو آج کالج سے چھٹی تھی، اور وہ سوچ رہے تھے کہ گو انھیں غسل کئے تین ماہ ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی انھیں غسل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک نہایت ذلیل قماش کا آدمی اندر داخل ہوا، پہلے تو پروفیسر صاحب نے سمجھا کہ پیشہ ور گداگر ہے، لیکن جب وہ جھک کر کورنش بجالایا تو انھیں اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی

" آداب عرض" پروفیسر دانش نے مصنوعی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا" تشریف رکھیے"!

پروفیسر صاحب کے کتبخانے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے علاوہ کہ جس میں وہ خود تشریف فرما تھے دوسری کوئی چیز نہ تھی، اس لئے نووارد تشریف رکھنے سے معذور رہا۔ یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے اپنے چہرے پر ایک اور مصنوعی مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا:۔

" تشریف رکھنا بھی ایک تکلف ہے، کیوں نہ آپ کھڑے کھڑے

مجھ سے گفتگو کریں۔ کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں "

" میں بہت دور سے آپ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں "

" شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

" نرغنہ سے "

" نرغنہ عجیب نام ہے۔ میرا مطلب ہے میں نے آجتک ایسا بیہودہ نام نہیں سُنا۔"

" میرا نام وحشت ہے "

" یک نہ شُد دو شُد۔ یقیناً آپ کے والدین نے نام انتخاب کرنے کے معاملے میں غلطی نہیں کی۔"

" میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے التماس ...."

" قطع کلام معاف " پروفیسر دانش نے بات کاٹتے ہوئے کہا " اگر آپ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ میں آپ کے کسی عزیز کے جس نے یونیورسٹی کا امتحان دیا ہے، نمبر بڑھا دوں تو میں صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے یہ اُمید ہرگز نہ رکھیئے گا۔"

" آپ کو غلط فہمی ہوئی، پروفیسر صاحب قبلہ۔ میں اس غرض سے حاضر نہیں ہوا۔"

" تو پھر؟ " پروفیسر دانش نے دانت پیستے ہوئے کہا " تو پھر

آپ ......"

نو وارد نے معاملہ بگڑتے ہوئے دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا" میں آپ سے التجا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس اتوار کو زحمتِ تشریف لائیں اور اپنے دستِ مبارک سے ایک غیر سرکاری پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھیں۔"

"پاگل خانے کا سنگِ بنیاد! لاحول ولا" پروفیسر دانش نے کرسی سے اچھل کر کہا "حضرت آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ جو ایسی نامعقول درخواست میرے پاس لیکر آئے۔ اس مطلب کے لئے تو آپ کو کسی قومی رہنما کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں پا......"

"گستاخی معاف" وحشت نے نہایت سنجیدگی سے کہا" میں متعدد رہنماؤں سے درخواست کر چکا ہوں لیکن بدقسمتی سے وہ اتنے مصروف ہیں کہ انھیں ایک لمحے کی فرصت نہیں۔ ایک صاحب اس ہفتے سات مقبروں کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں۔ دوسرے پانچ یتیم خانوں کی رسم افتتاح ادا فرما رہے ہیں اور تیسرے رعشہ کے مرض میں مبتلا ہیں اور ان کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں کہ کسی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ سکیں۔"

"تو پھر کسی وزیر یا گورنر سے التماس کیجیئے۔"

"وزراء اور گورنر حضرات کو ٹی پارٹیوں سے فرصت ہی کب ملتی

ہے کہ وہ کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو سکیں ۔"

"کچھ بھی ہو ۔ میں اس کام کے لئے ہرگز تیار نہیں ۔"

"ضد نہ کیجئے ۔ پروفیسر صاحب ! قوم کو آپ سے بہت توقعات ہیں ۔"

قوم کا نام سُن کر پروفیسر صاحب بھنّا اُٹھے اور انھوں نے چیخ کر کہا " قوم جہنّم میں جائے ۔ قوم نے میرے لئے کیا کیا ہے ؟ کہ میں اس کی پروا کروں ۔ جب ملک غلام تھا تو میں پچاس روپے ماہوار پر اُردو پڑھاتا تھا ۔ اب جب ہم آزاد ہیں ۔ میں اسی تنخواہ پر یہ مضمون پڑھا رہا ہوں ۔ مجھے قوم سے کوئی ہمدردی نہیں کیونکہ قوم کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ۔ "

"مجھے یہ سب معلوم ہے ۔ اس کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ۔ کہ آپ سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں ۔"

"میں نہیں ہوں ۔"

"آپ ہیں "

"میں ہرگز نہیں ہوں ۔"

"آپ بالکل ہیں "

یہ بحث کافی دیر جاری رہی ۔ اور جب بحثتے بحثتے پروفیسر دانش کا سانس اکھڑنے لگا تو انھوں نے اور چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے تسلیم کر لیا کہ وہ اس کام کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں ۔"

(۲)

اتوار کے دن ترغنہ جیسے دور افتادہ قصبے میں خوب چہل پہل تھی۔ لوگ جوق در جوق "مجنوں پارک" میں کہ جہاں ملک کے پہلے غیر سرکاری پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھا جانا تھا، اکٹھے ہو رہے تھے حسب وعدہ پروفیسر دانش اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر سوار ہو کر شام کے ۶ بجے تشریف لے آئے۔ وحشت نے قصبہ کے معززین کی معیت میں آپ کا استقبال کیا۔ انھیں گڑ کی چائے پلائی، پھولوں کے ہار پہنائے اور خواتین و حضرات سے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:-

"پروفیسر دانش کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ آپکا شمار ملک کے ان علما میں ہوتا ہے جن پر ہم سب کو ناز ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھنا قبول کیا...... میں نہایت ادب سے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مبارک رسم کو اپنے مبارک ہاتھوں سے ادا فرمائیں۔"

پروفیسر دانش نے جلدی جلدی پتھر کے چبوترے پر سمینٹ لگائی اور مزدوروں کو جو لمبے لمبے رسوں سے ایک بہت بڑے پتھر کو تھامے کھڑے تھے، اشارا کیا۔ کہ سنگِ بنیاد کو نیچے آنے دیں۔ حاضرین نے

تالیاں پیٹیں اور پروفیسر صاحب گھبرا کر ماتھے سے پسینہ پوچھنے لگے۔ جب انھیں یقین ہوگیا کہ سنگِ بنیاد مطلوبہ جگہ پر رکھا جا چکا ہے تو انھوں نے دو ایک بار کھانسنے کے بعد حاضرین سے خطاب کیا:

"خواتین و حضرات! میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کرونگا کیونکہ اگر میں ایسا کروں تو اس کا مطلب ہوگا۔ کہ مجھے واقعی آپ کے قصبے میں آکر خوشی ہوئی ہے۔ حالانکہ یہاں تک پہونچنے میں جتنی کوفت مجھے اٹھانا پڑی اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ اوّل تو آپ لوگوں نے اپنا قصبہ دہلی سے اتنے فاصلے پر بنایا ہے کہ سائیکل چلاتے چلاتے چلاتے میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ دوسرے جو سڑک آپ کے قصبے کو دہلی سے ملاتی ہے، اتنی گرد آلود ہے کہ میری شیروانی کا ستیاناس ہوگیا۔

خواتین و حضرات! میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میری ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے مجھے کالج کی چاردیواری کے باہر کوئی شخص نہیں جانتا۔ اور بعض اشخاص مثلاً سینیر جماعتوں کے طلبا تو مجھے کالج کی چاردیواری میں بھی نہیں پہچانتے۔ میرا شمار یقیناً علما میں نہیں

ہوتا، کیونکہ میں اس حد تک جاہل نہیں جس حد تک ہمارے بیشتر علماء واقع ہوئے ہیں۔ میں ایک نہایت گمنام آدمی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اگر میرا چہرہ قدرے اور بدصورت اور جسم کافی منحنی ہوتا تو میں وزیر یا کم از کم سفیر ہوتا۔ لیکن افسوس۔ خدا کو یہ منظور نہیں تھا میں ایک نہایت ذلیل کالج میں پچاس روپئے ماہوار مشاہرہ پر اُردو پڑھاتا ہوں اور طلبا کی' اغلاط سے پُر کاپیوں کو دیکھ کر عاجز آ گیا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے آج سے قبل کسی عمارت کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا۔ میں عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے کی رسم کو ایک نہایت مذموم بدعت سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں یہ کام معماروں اور انجینیروں کا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک پروفیسر سے جسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ریت اور سمینٹ میں کیا فرق ہے اس قسم کی درخواست کرنا بے ہودگی کی انتہا ہے۔

میرا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ گذشتہ زمانے میں کسی خوبصورت عمارت کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا۔ آپ ہی بتائیے۔ لال قلعے یا قطب مینار کا سنگِ بنیاد کس نے رکھا تھا۔؟ خیر چھوڑیے اس بحث کو۔۔۔اب

ذرا پاگل خانے کی طرف آیئے جس کا سنگِ بنیاد میں نے ابھی ابھی رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں غیر سرکاری پاگل خانوں کی تعمیر ایک نہایت مبارک فال ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں پاگلوں کی تعداد اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ ہم سب پریشان ہیں کہ انھیں کہاں رکھا جائے گا۔ زمانۂ ماضی میں صرف عشاق کو پاگل تصور کیا جاتا تھا لیکن عصرِ حاضر میں ہر شخص پاگل ہے۔ معاف کیجئے بہت سے اشخاص پاگل ہیں۔ زمانۂ سابق کے دیوانے بے ضرر انسان ہوا کرتے تھے۔ ان کے مشاغل محدود تھے۔ یعنی بیٹھے بیٹھے اگر ان کے دل میں درد اٹھتا تھا تو زیادہ سے زیادہ وہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالتے تھے یا سنگِ آستاں سے اپنا سر پھوڑ لیتے تھے لیکن زمانۂ حال کے دیوانے سخت خطرناک واقع ہوئے ہیں کیونکہ وہ بکارِ خویش ضرورت سے زیادہ ہشیار ہیں۔ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام میں نفرت اور حقارت کے بیج بو کر اپنی دیوانگی چمکائی جائے۔ ہمیں ان لوگوں پر کڑی سی نگرانی رکھنا ہوگی۔ میرے خیال میں آپ کو اس پاگل خانے میں تین وارڈ بنانے ہونگے۔ پہلے وارڈ میں اُن تمام

سرپھرے لیڈروں کو رکھا جائے گا۔ جن کی دانست
میں ملک کو کسی ریفارم کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سمجھتے
ہیں کہ ایک آزاد ملک میں عوام کو بھوکوں مرنے اور
ننگا پھرنے کی آزادی ہونا چاہیئے۔ دوسرے وارڈ
میں وہ نااہل پنڈت اور مولوی رکھے جائیں گے
جن کے نزدیک مذہب ہر وقت خطرے میں ہے۔
اس ضمن میں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان
لوگوں کو تادمِ زیست پاگل خانے سے باہر آنے کی
اجازت نہ دی جائے۔ نیز پاگل خانے کے ضوابط
کے مطابق انھیں نہایت "خطرناک جنونی" تصور
کیا جائے۔ تیسرے وارڈ میں ان نیم خواندہ اڈیٹروں
کو رکھا جائے گا، جو فرقہ وارانہ خیالات کا پرچار
کرکے عوام کو آپس میں لڑاتے ہیں۔ تو خواتین و
حضرات! یہ ہے وہ بلند آدرش جس کی تکمیل
کے لئے اس پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا
آخر میں آپ کی اجازت سے یہ تجویز پیش کرنا
چاہتا ہوں کہ دہشت صاحب کو اس پاگل خانے
میں ایک کوٹھری ضرور عطا کی جائے۔ تاکہ وہ مجھ ایسے
شریف حضرات کو آئندہ دق نہ کرسکیں۔"

پروفیسر دانش کے آخری فقرے پر وحشت بہت سیخ پا ہوا لیکن اس اثنا میں پروفیسر صاحب پلیٹ فارم سے اُتر کر سائیکل پر سوار ہو چکے تھے۔ اور اس سے پیشتر کہ وحشت ان سے اپنے الفاظ واپس لینے کو کہتا، وہ نرنجنہ سے دہلی جانے والی سڑک پر سائیکل چلاتے ہوئے گنگنا رہے تھے ع

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اہلِ جنوں کی

ڈیر کیلاش چندر!

(۱)

ڈیر کیلاش چندر!

میں ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر یہ خطوط لکھ رہا ہوں وہ مقصد صرف اتنا ہے کہ خدانخواستہ تم پر کبھی ایسا وقت آن پڑے کہ تم بالکل تہی دست ہو جاؤ۔ اور تمھارے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوں کہ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی ترشوا سکو۔ اس وقت یہ خطوط شایع کر کے کم از کم حجام کا بل ادا کر سکو۔ ان خطوط میں بہت سی غیر ضروری باتیں ہوں گی۔ شاید ان کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عوام اتنے سمجھدار نہیں کہ ضروری اور غیر ضروری میں امتیاز کر سکیں۔ ان کے لئے یہی غنیمت ہے کہ ایک ایسے شخص کے خطوط اس کی

وفات کے بعد منظر عام پر آئے ہیں۔ جیسے اس کی زندگی میں انھوں نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ میں ان خطوط میں ہر اس موضوع پر تبصرہ کروں گا جسے میں بالکل نہیں سمجھتا۔ سیاست کو ہی لو۔ یہ حقیقت ہے کہ عمر بھر میں سیاست کو اس قدر ہی سمجھ سکا جتنا کہ غالبؔ تم۔ بلکہ تم کچھ زیادہ ہی سمجھ سکے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ تم نے خاکروبوں کی کانفرنس میں خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کو سمجھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اسے سمجھنے سے پہلے، فہم و فراست کو خیرباد کہنا ہوگا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جب تک کسی شخص کا دماغی توازن قائم ہے، اُسے اپنے ملک کی سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد، یہ سیاست کچھ اس طرح اُلجھ گئی ہے کہ میں تو کیا مجلس اقوام متحدہ نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست ایک گورکھ دھندا ہے جسے الجھایا تو جا سکتا ہے لیکن سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اور چونکہ اسے اُلجھانے کے لئے مجھ سے بہتر دماغ پہلے ہی سے کوشش کر رہے ہیں اس لئے میں اس موضوع پر کچھ نہیں کہوں گا۔ ویسے کبھی کبھی مجھے خیال ضرور آتا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ اگر ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے تو آخر کون سی آفت آگئی۔ ہندو مسلم پہلے بھی ہمسائے تھے۔ آج بھی ہمسائے ہیں۔ پاکستان ایک نیا ملک۔ نئی خلیج نہیں کہ جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ تم تو یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہو لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دونوں ممالک کے لیڈر

کافی ناتجربہ کار ہیں۔ اور اس ناتجربہ کاری کا سب سے بڑا سبب چھپنا نہیں بڑھایا ہے۔

خیر مجھے سیاست سے کیا لینا دینا۔ میں کیوں نہ خالص ادبی موضوعات پر اظہار خیال کروں۔ ادب کیا ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود نہیں جانتا۔ چند دن ہوئے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی جس میں اس موضوع سے بحث کی گئی تھی کہ آیا "ریلوے ٹائم ٹیبل" ادب ہے یا نہیں۔ مصنف کی رائے میں ریلوے ٹائم ٹیبل ادب کی صنف سے خارج ہے۔ مجھے اس مصنف سے اتفاق نہیں۔ میرے خیال میں ریلوے ٹائم ٹیبل بڑے کام کی چیز ہے اور جو چیز کام کی ہو اُسے ادب کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اگر پرانے ادب کا نہیں تو کم از کم نئے ادب کا۔ نیا ادب بھی میری ناقص دانست میں اس لئے نیا ادب ہے کیونکہ اس میں کام کی چیزیں ہیں۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں بہت سے اشتہارات ہوتے ہیں جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس میں سفر کے متعلق نہایت کارآمد ہدایات ہوتی ہیں اور اگر "سفر" زندگی کا دوسرا نام ہے تو ریلوے ٹائم ٹیبل " ادب برائے زندگی " ہے۔ تم کہو گے یہ عجیب منطق ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ بہت سی کتب جنھیں " ادب عالیہ " کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، افادیت کے لحاظ سے ریلوے ٹائم ٹیبل سے بہتر نہیں۔

کم از کم آپ ریلوے ٹائم ٹیبل کو سمجھ سکتے ہیں لیکن بیشتر جدید

ادبی تخلیقات کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ادب کا ذکر کرتے ہوئے لازماً مجھے ادبا کا خیال آتا ہے۔ ادیب کون ہے؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں ابھی تک کوئی بھی نہیں۔ شاید گزشتہ زمانے میں یہاں ادیب ہوتے ہوں گے۔ لیکن بات تو زمانۂ حال کی چل رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چند لوگ کبھی کبھی ادیب ہونے کا دعوےٰ ضرور کرتے ہیں۔ لیکن صرف دعوےٰ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ایک نقاد کی رائے ہیں ادیب وہ شخص ہے جس کی قدر اس کی وفات کے بعد کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال اور منشی پریم چند بلاشبہ ادیب تھے۔

ہندوستان اور پاکستان ہیں اب ادیب کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ وہ یہاں پیدا ہونا نہیں چاہتے دوسری یہ کہ اگر غلطی یا اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں تو انھیں یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی اور بہت جلد وہ ادب کا چوغہ اُتار کر پروفیسری کلرکی یا مکالمہ نویسی کا طوق پہن لیتے ہیں۔

ہندی زبان کے ایک شاعر نے کہا ہے "ہندی شاعری کا سورج سورداس، چاند تلسی داس، اور ستارہ کیشو داس ہے۔ آج کل کے شاعر تو جگنو کی طرح ہیں جو کبھی کبھی روشنی کی جھلک دکھا کر تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں۔"

اس کلیہ کا آخری ٹکڑا اُردو کے جدید ادبا پر صادق آتا ہے

اردو ادب نے گزشتہ چند سالوں میں بے شمار جگنو پیدا کئے ہیں۔ (ڈاکٹر اقبال نے جگنو پر جو نظم لکھی تھی اس میں انھیں او باکی طرف اشارا ہے) ...... انگلستان اور امریکہ میں کئی اخباری نمایندے محنت یا ترقی کرتے کرتے ادیب بن جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ممالک میں صورت حال بالکل برعکس ہے۔ یہاں بھلا چنگا ادیب ایک جست میں ادیب سے کتب فروش بن جاتا ہے۔ کوئلے کا بیوپار شروع کر دیتا ہے یا فلموں میں مزاحیہ کردار کی حیثیت سے کام کرنے لگتا ہے۔ تم کہوگے۔ شاید اس کی وجہ اقتصادی مشکلات ہیں۔ لیکن کس ملک اور کس صدی میں ادباکو ان مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگر میر۔ غالب۔ پریم چند۔ ملٹن اور برنارڈ شا اقتصادی مشکلات سے گھبرا کر صابن بنانے کا کارخانہ قائم کر لیتے تو آج ان کی ادبی تخلیقات کی عدم موجودگی میں اردو اور انگریزی ادب کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔

(۲)

اس خط میں صرف ان امراض کا ذکر کروں گا جن میں آج مبتلا ہوں۔ تم پوچھوگے اس خط کو کتابی صورت میں شایع کرنے کا فائدہ! ایک فائدہ تو ظاہر ہی ہے کہ کتاب کے حجم میں ایک آدھ صفحے کا اضافہ ہوجائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ قارئین کو پتہ چل جائے گا کہ میں پروفیسر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجے کا دائم المریض بھی تھا۔ مجھے خدا کے فضل اور تمھاری دعا سے ہر مرض میں مبتلا ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بستر سے اُٹھتے ہی کھانسنا شروع کر دیتا ہوں۔ اور دوپہر تک کھانستا چلا جاتا ہوں۔ میری کھانسی بھی جگر مراد آبادی کے معشوق کی یاد ہے یعنی آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے۔ کھانستے کھانستے پسلیوں میں درد ہونے لگتا ہے، تو روغن زیتون کی مالش کرنے لگتا ہوں۔ روغن زیتون بڑا کارآمد روغن ہے بشرطیکہ اس میں تھوڑا سا مُشک کافور ملا لیا جائے۔

سہ پہر کو عموماً مجھے تو لنج کا دورہ پڑتا ہے اور درد سے چیختے چیختے بے حال ہو جاتا ہوں۔ شام کے وقت سر درد باز کام آ دباتا ہے۔ رات کو بے خوابی کی حالت میں کباب سیخ کی طرح کروٹیں بدلتا رہتا ہوں حتیٰ کہ صبح ہو جاتی ہے۔ آمدنی کا بیشتر حصہ حکیموں اور ڈاکٹروں کی نذر کر چکا ہوں۔ لیکن ابھی تک صاحب فراش ہوں۔ دراصل اس میں معالجوں کا اتنا قصور نہیں جتنا کہ میری صحت کا ہے اکثر جب ایک مرض کا علاج کرتا ہوں۔ تو دوران علاج میں ایک نیا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ چند دن ہوئے مجھے خارش کی شکایت تھی۔ ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا اس نے بتایا کہ "اس مرض کا فوری علاج "پین سلین" ہے۔ "پین سلین" کے پچاس ٹیکے لگوا لیجئے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ خارش تو وہاں ہی رہی جہاں تھی۔ لیکن اس دن سے بوٹی بوٹی درد سے کراہ رہی ہے۔ اس حادثے کے بعد میں نے ہر قسم کے علاج سے توبہ کر لی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علاج سے مرنے کی بجائے

مرض سے مرنا بدرجہا بہتر ہے

(۳)

اُسے مُجھ ہیچ پوچ کو واقعی ہیچ پوچ سمجھنے والے! اے میری غیر ذمہ دارانہ حرکتوں پہ آنسو بہانے کی بجائے کھِل کھلاکر ہنسنے والے کیلاش حیدر! تمھارا خط ملا۔ آنکھوں سے لگایا۔ آنکھوں کی بینائی کم ہوگئی۔ کلیجے سے چپکایا۔ کلیجہ جل بھُن کر راکھ ہوگیا۔ اس کے بعد جسم کے کسی اور عضو سے اُسے لگانے کی ہمت نہ پڑی۔ یہ تم نے کیا نئی بحث چھیڑ دی کہ "اردو شعرا اپنی غزلوں میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اور کبھی خدا لگتی نہیں کہتے"۔ معلوم ہوتا ہے غزل پڑھتے وقت تم مقطع کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہو۔ شاید اس لئے کہ اس میں سخن گسترانہ بات آپڑتی ہے۔ تو سنو۔ غزل کا سب سے ضروری شعر مقطع ہی ہوتا ہے۔ وہ ایسے کہ مطلع تو اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے بغیر غزل شروع نہیں ہوسکتی اور باقی اشعار اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ اگر نہ لکھے جائیں تو مطلع اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرے گا مطلع سے مقطع تک پہنچنے میں شاعر قوافی کی تلاش میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اُسے کام کی بات کہنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی آخر جب ایک ایک کر کے تمام قوافی ختم ہوجاتے ہیں تو وہ آدم برسرِ مطلب کے مقولے پہ عمل کرتے ... ہوئے اس جذبے کا اظہار کرتا ہے جس نے اُسے غزل لکھنے پہ اکسایا۔ مثال کے طور پہ ڈاکٹر تاثیر

کا ایک مقطع ہے ع

میں کیا ہوں اور مرے اشعار کیا ہیں بے تاثیر

(دوسرا مصرع مجھے یاد نہیں آرہا۔ لیکن پہلے مصرعے کے تیور بتا رہے ہیں کہ دوسرا کس شان کا ہوگا) اس مصرعے میں شاعر نے جس صاف گوئی سے اپنی اور اپنے اشعار کی وقعت پر طنز کیا ہے۔ اس کی داد نہ دینا پرلے درجے کی بد مذاقی ہوگی۔

جناب حفیظ جالندھری کا مشہور مقطع تو تم نے سنا ہی ہوگا۔

حفیظ! اہلِ زباں کب مانتے تھے

بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس شعر میں حفیظ نے جس صدق دلی سے اپنی اور اہلِ زبان کی ڈھٹائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی نظیر اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔

لیکن ان دو مثالوں کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر مقطع کے علاوہ کسی اور شعر میں حقیقت نگاری سے کام نہیں لیتا۔ بعض اوقات تو وہ اس قدر بھرا بیٹھا ہوتا ہے کہ چھوٹتے ہی دل کی بات کا اظہار کر دیتا ہے۔ شاعرِ انقلاب جناب جوش جب رسالہ "آجکل" کے مدیر مقرر ہوئے تو انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع تھا

کل چھلکتے تھے پیالے، آج خالی جام ہے

وہ دمکتی صبح تھی، یہ جھلملاتی شام ہے

یہ شعر اپنے اندر کتنی حسرتیں چھپائے ہوئے ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس میں " آج " اور " کل " کے دونوں الفاظ شامل ہیں۔

امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔ دیگر اُمید ہے کہ تم بخیریت ہو گے۔ خدانخواستہ نہیں ہو تو مجھے لکھنے کی بجائے کسی لائق ڈاکٹر سے رجوع کرو۔

(۴)

چند دن ہوئے میں نے ایک لنگور خریدا تھا۔ اس خط میں اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم کہو گے بھینس یا گائے کی بجائے لنگور کیوں خریدا؟ صاف بات تو یہ ہے کہ بھینس یا گائے خریدنا میری بساط سے باہر تھا۔ اور بالفرض اگر خرید بھی لیتا تو پھر انھیں رکھنے کے لئے میرے پاس جگہ کہاں تھی؟ یہاں تو بڑی مشکل سے اپنا سر چھپانے کے لئے ایک کوٹھری پچاس روپئے ماہوار پر لی ہے۔ اس کا کرایہ بھی تین ماہ سے نہیں چکایا۔ لنگور نہایت دلچسپ جانور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لنگور بدصورت جانور ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے میں نے ہزاروں ایسے انسان دیکھے ہیں جو لنگور سے بھی بدصورت تھے۔ اس لنگور میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں۔ میں نے کئی بار اس سے سوال کیا ہے:۔

" ہندوستان میں رہنا چاہتے ہو یا پاکستان میں؟ "

ہر بار اس نے یہی جواب دیا ہے " جنگل میں "

"ہندو اچھے ہیں یا مسلمان ؟"

"لنگور دونوں سے اچھے ہیں۔"

عجیب مسخرا ہے۔ سارا دن اس بات کی رٹ لگاتا رہتا ہے کہ ڈارون بھی ایک چند تھا۔

ایک دن میں نے پوچھا "یہ تم ڈارون کو ہر وقت کیوں کوستے رہتے ہو ؟"

نہایت سنجیدہ صورت بنا کر کہنے لگا "کمبخت انسان کو بندر کی اولاد ثابت کر کے ہمیں ہمیشہ کے لئے رسوا کر گیا۔"

(۵)

یہ میرا آخری خط ہے۔ اس میں متفرق باتوں کا ذکر کروں گا مثلاً گائے اور اونٹ آپس میں کیوں لڑتے ہیں ؟ اردو زبان میں آج تک کوئی اچھا ناول کیوں نہیں لکھا گیا ؟ مرغیاں پالنے کا کیا نقصانات ہیں ؟ لمبی داڑھی رکھنے کے کیا فوائد ہیں ؟ ہم کیوں ہنستے ہیں ؟ عورتیں مردوں کی نسبت کیوں چالاک ہوتی ہیں ؟ شہد کی مکھی اور معمولی مکھی میں کیا فرق ہے ؟ جدید ادبا میں سے کون کون زندہ رہے گا ؟

میں ان تمام سوالوں سے بحث کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ڈاکٹر تاثیر ادب کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔ اسی طرح میں زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوں۔ سب سے پہلے میں اس سوال کی

طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو گائے اور اونٹ سے متعلق ہے۔

یقیناً یہ عصر حاضر کا سب سے اہم سوال ہے۔ میری دانست میں اس سوال کا جواب یہ ہونا چاہیئے کہ گائے اور اونٹ دونوں بیوقوف جانور ہیں۔ ان کی بیوقوفی اس بات سے عیاں ہے کہ باوجودیکہ دونوں باہر سے چراگاہ میں چرنے کے لئے آئے ہیں لیکن دونوں میں سے ہر ایک سمجھتا ہے کہ چراگاہ صرف اسی کی واحد ملکیت ہے...... اب دوسرے سوال کی طرف آئیے..... اردو ادب میں ایک اچھا ناول کیوں نہیں لکھا گیا؟ یقیناً آپ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ تو سنیئے میں بتاتا ہوں۔ ایک اچھا ناول لکھنے کے لئے دو چیزوں کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ فراغت اور دماغ۔ چونکہ کسی جدید اردو ادیب کے ہاں بیک وقت یہ دونوں نعمتیں موجود نہیں اس لئے اردو زبان میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا۔

مرغیاں پالنے کے کیا نقصانات ہیں؟ بے شمار نقصانات ہیں۔ پہلا تو یہ کہ عموماً مرغیاں ہمسایوں کے گھروں میں انڈے دیتی ہیں۔ اور مرغیاں پالنے والے کو انڈے بازار سے خریدنے پڑتے ہیں دوسرے یہ کہ ہر شام ایک آدھ مرغی ضرور غائب ہو جاتی ہے یعنی کہ کچھ عرصے کے بعد ایک بھی نہیں رہتی۔

لمبی داڑھی رکھنے کا صرف ایک فائدہ ہے وہ یہ کہ انسان

بیوقوف ہونے کے باوجود بیوقوف نظر نہیں آتا۔

ہم کیوں ہنستے ہیں؟ اس لئے کہ ہمیں ہنسی آتی ہے اور بعض اوقات اس لئے بھی کہ اگر ہم نہ ہنسیں تو دوسرے ہنسنے والے ہمیں بیوقوف سمجھیں گے۔

عورتیں مردوں کی نسبت اس لئے زیادہ چالاک ہوتی ہیں، کیونکہ انھیں اپنی اصلی عمر چھپانے کے آرٹ میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

شہد کی مکھی اور معمولی مکھی میں یہ فرق نہیں کہ شہد کی مکھی ہمارے گھروں میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اور معمولی مکھی کے علاوہ ہمارے گھروں میں اور بہت کم چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بلکہ یہ کہ اگر معمولی مکھی ہیضہ پھیلانے کی بجائے شہد اکٹھا کیا کرتی۔ تو ہمارے ملک میں شہد کی وہ بہتات ہوتی۔ کہ ہمیں گڑ۔ شکر اور کھانڈ کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

جدید ادبا میں سے کون زندہ رہے گا؟ زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیشتر تو اپنی زندگی ہی میں اللہ کو پیارے ہو چکے۔ باقی زندہ درگور ہیں۔ وثوق سے تو نہیں البتہ کافی ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر جوش اپنے کلام کے انتخابات کے علاوہ اپنی تمام تصنیفات نذرِ آتش کر دیں اور جگر اور فراق اپنی اپنی غزلوں سے پچاس فیصدی اشعار حذف کر دیں تو جدید اردو شاعری میں یہ تین شاعر زندہ رہیں گے۔

اردو افسانے میں کرشن چندر کا ایک بٹا دو حصہ۔ منٹو کا ایک بٹا تین حصہ اور عصمت کا ایک بٹا چار حصہ زندہ رہے گا۔ اردو تنقید اردو ناول، اردو ڈرامہ میں شاید غلطی سے کوئی زندہ رہ جائے۔ ویسے کسی کے زندہ رہنے کے آثار نظر نہیں آتے۔

آخری خط کو ختم کرنے سے پہلے میں ان خطوط کے متعلق چند ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ ان خطوط کو شائع کرتے وقت تمھیں کھلی اجازت ہے کہ تم ضخامت بڑھانے کے لئے متعدد فرضی اور جعلی خطوط کتاب میں شامل کر سکتے ہو۔ کم از کم ایک عکسی خط ضرور شائع کیا جائے۔ چونکہ تمھارے علاوہ کوئی شخص میرے دستخط سے واقف نہیں اس لئے یہ خط خود لکھ کر یا کسی اور سے لکھوا کر اس کا عکس لے لیا جائے۔

ان کی خدمت میں سلام و شوق

نوٹ:۔ یہ "ان" قطعی فرضی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری کسی "ان" سے سرسری ملاقات بھی نہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو اس "ان" کے متعلق کتاب کے آخر میں ایک طویل مگر ناقابلِ یقین نوٹ دے دینا ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

اردو ادب کا آخری دَور

راوی :-

خدا خدا کر کے اردو کا پانچواں دور ختم ہوا۔ اللہ اللہ کیسی کیسی صورتیں تھیں کہ خاک میں پنہاں ہوگئیں۔ ع

وقتِ شعر و شاعری بگذشت و رفت

اب چند عجیب و غریب لوگ کہ جنھیں دیکھ کر عقل انگشت بدنداں اور دماغ حیراں و پریشاں ہے۔ بزمِ ادب میں تشریف لاتے ہیں کندھوں پر اُردو شاعری کا جنازہ اٹھائے "ہائے ردیف ہائے قافیہ" کے بین کرتے ہوئے جوں ہی انھوں نے شبستانِ شاعری میں قدم رکھا۔ یک لخت تمام شمعیں گل ہوگئیں۔ تغزل نے آخری ہچکی لی اور ترنم ہاشیہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ اس گھُپ اندھیرے میں حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ کر ہر ایک شاعر مسند کی طرف بڑھا۔ ان تمام میں یوسف ظفر پیش پیش تھے۔

یوسف ظفر:۔

نام یوسف لیکن تخلص ظفر تھا یا نہیں، اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ نہایت مرنجاں مرنج بلکہ مریل قسم کے انسان تھے۔ اوائل عمر میں عجیب و غریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخری عمر میں بھی کوئی خاص فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

مشاعروں میں اپنا کلام اس طرح پڑھتے تھے جیسے کسی دوسرے کا کلام پڑھ رہے ہوں۔ غزل اچھی کہہ لیتے تھے۔ بایں ہمہ غزل سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ نظمیں کہنے کا جنون تھا۔ اکثر نظم کہنے کے بعد کافی ہاؤس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ میخانے میں جانے کی آخری دم تک توفیق نہ ہوئی۔ چند سال حضرت ظہیر کے زنداں میں گزارے وہاں سے سیدھے "ہمایوں" کے مقبرے میں پہونچے اور وہیں دفن ہوئے۔

قیوم نظر، اور میراجی نے تاریخ وفات کہی ع

"حیف صد حیف ظفر مرد"

اس مصرعے سے وفات کا سن ۱۹۶۸ نکلتا ہے کہ جو قریب قریب صحیح ہے۔ کیونکہ آپ نے ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:۔ کلام ان کا بے نظیر ہے۔ کہیں سے اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ سمجھ میں نہیں آئے گا۔

قیوم نظر:۔

پورا نام مولوی عبدالقیوم بٹ تھا لیکن بخوف طوالت اپنے

آپ کو قیوم نظر کہتے تھے۔ غزل سے نظم اور نظم سے گیت کی طرف رجوع کرنے کے بعد مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ زندہ دلی طبیعت کا خاصہ تھی۔ کلرک ہونے کے باوجود محفلوں میں کھل کر ہنستے تھے۔ اکثر یوسف ظفر سے چشمک رہتی۔ شاید اس لئے کہ ان کی "قندیل" کے سامنے ظفر کا چراغ نہیں جل سکا تھا۔

متعدد گیت تھے جو ریڈیو سٹیشنوں پر گائے جانے کے باوجود مقبول نہ ہو سکے۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں کمال حاصل تھا۔ بشرطیکہ نشانۂ مشق کوئی دوسرا شاعر ہو۔ میراجی سے عقیدت اور اُن کے سوائے ہر شاعر سے وحشت تھی۔

لطیفہ:۔ ایک محفل میں آپ نے یوسف ظفر کے ایک شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا "کاش آپ اتنے بیوقوف ہوتے کہ میرے تمام گیت لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔"

یوسف ظفر نے سرد آہ بھر کر جواب دیا "کاش میں اتنا بیوقوف ہوتا!"

حفیظ ہوشیارپوری

نام حفیظ لیکن ہوشیارپوری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وضع قطع میں حفیظ جالندھری سے خطرناک حد تک مشابہت رکھتے تھے۔ اس تمنا میں ہزاروں غزلیں کہیں کہ شاید کوئی شعر کام کا ہو جائے۔ لیکن افسوس! یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ روایت ہے کہ ان کے پاس غزل

کا ایک سانچہ تھا۔ جس میں الفاظ و تراکیب ڈال کر غزل نکال لیا کرتے تھے۔ دواوین کی صحیح تعداد کا اندازہ لگایا نہیں جا سکا۔ کیونکہ بیشتر کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے شایع نہ ہو سکے۔ ہر غزل میں قریب قریب وہی بات کہتے جو اس سے پہلی غزل میں کہہ چکے تھے۔

لطیفہ :۔ ایک ریڈیو مشاعرے میں ایک گستاخ چھوکرے نے آپ کی غزل پر اعتراض کیا کہ "اشعار بے جان ہیں" آپ نے جواب کر فرمایا:۔ "میں شاعر ہوں، ابن مریم نہیں کہ مردہ اشعار میں روح پھونک سکوں۔" معترض دم بخود ہو گیا۔

عبدالمجید بھٹی :۔

نہایت بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں مغز کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ پہلے بچوں کے لئے گیت لکھتے تھے۔ بعد میں نوجوانوں کے لئے نغمے لکھنے لگے۔ زبان میں ہندی الفاظ کو ترجیح دیتے تھے۔ بقول سالک "اردو زبان کو آج سے دو سو برس پیچھے لے جانا آپ کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔ ان کے کلام بلاغت نظام پر حفیظ جالندھری نے بیش لفظ لکھا کہ جو آپ کے کلام کی ضخامت سے کم از کم تگنا ہے۔

نمونۂ کلام :۔ آپ کا کلام پڑھنے کی بجائے کوئی الجبرا کی کتاب پڑھ لیجئے۔

ساحر لدھیانوی

پورا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آیا تخلص کرتے تھے یا سحر۔ اس کے

متعلق بھی بیشتر محققین کو شک ہے۔ کلام پڑھتے وقت زبان کی
بجائے ناک سے زیادہ کام لیتے تھے۔ چہرے پر چیچک کے داغوں کے
علاوہ خستہ حالی کے متعدد نشان تھے۔ کوٹ اتار دیتے تو یوں معلوم
ہوتا جیسے ابھی ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔
طبیعت کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔ تاج محل کو اس لئے
پسند نہ کر سکے۔ چونکہ جھونپڑا تک میسر نہ تھا۔ اکثر میل لائن پر سفر
کرتے تھے۔ لدھیانہ سے بمبئی اور بمبئی سے لاہور اور لاہور سے دہلی
پہونچے اور مطلوبہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ماسکو نہ جا سکے۔
عمر بھر مارکس کا فلسفہ جس حد تک اسے سمجھ سکے نظموں میں قلمبند
کرتے رہے۔ بے ضرر انسان تھے۔ اس لئے حکومت نے کبھی گرفتار کرنے
کی ضرورت نہ سمجھی
نمونۂ کلام:۔ طوائف! مزدور!! سرخ پرچم!!!

فکر تونسوی

تونسہ شریف کے رہنے والے تھے لیکن شکل و شباہت سے
معلوم ہوتا تھا کہ عدم آباد کے رہنے والے ہیں۔ فسادات لاہور میں
کوشش کے باوجود شہید نہ ہو سکے کہ ہندوؤں نے آپ کو ہندو
اور اہل اسلام نے مسلمان سمجھا۔ پہلے کچھ بھی نہ تھے۔ پھر کلرک ہو گئے
اور پھر خدا جانے رفتہ رفتہ کیسے شاعر بن گئے۔ فاقہ کش نظر آتے
تھے اور در اصل فاقہ کش ہی تھے۔ جس مجلس میں کلام پڑھتے۔ وہ مجلس

درہم برہم ہو جاتی تھی۔ سگریٹ اور بے قافیہ نظم کے عاشق تھے آپ کی شاعری کو آپ کے علاوہ صرف دو ایک ادیب سمجھ سکے۔ آپ نے اردو ذخیرۂ الفاظ میں ایک نئے لفظ "تونسوئیت" کا اضافہ کیا۔

تونسوئیت:۔ عموماً اس شاعری کو کہتے ہیں جسے بائیں سے دائیں یا اوپر سے نیچے پڑھا جائے تو مطالب میں چنداں فرق نہیں پڑتا۔

راوی:۔ الحمد اللہ اردو کے آخری دور کے شعرا رخصت ہوئے۔ اب نثر نگاروں کا دور دورہ ہے۔ فصاحت و بلاغت کے نئے نئے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ مقام تعجب ہے کہ ابھی تک خوشہ چینوں کو خبر نہیں ہوئی۔ گیسوئے نثر اب منت پذیر شانہ نہیں کیونکہ اسے سنوارنے کے لئے ہر ایک مشاطہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے نثر نگاروں کی وہ بھرمار ہے کہ نہ اُن کا کوئی شمار ہے نہ اُردو نثر کو قرار۔ وہ دیکھیئے نثر نگار قطار اندر قطار شتر بے مہار کی طرح محفل ادب میں تشریف لا رہے ہیں، ادھر انھوں نے دروازے پر دستک دی ادھر زبان اور محاورے نے سر تسلیم خم کر لیا اور تنقید "جو مزاج یار میں آئے" کہہ کر گنگ ہو گئی۔

کرشن چندر:۔

کشمیری نژاد تو نہ تھے لیکن ان کی گنجی چاند اور خوبصورت آنکھوں کو (جو عینک لگانے سے پہلے واقعی خوبصورت تھیں) دیکھ کر

کبھی کبھی ان کے کشمیری ہونے کا شبہ ضرور ہوتا تھا۔ کشمیر نہ اُن کا نہ ان کے آبا و اجداد کا مسکن تھا۔ لیکن جہاں بھی جاتے تھے۔ کشمیر اُن کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ طبیعت اس قسم کی پائی تھی کہ ایک جگہ کبھی جم کر نہ بیٹھ سکے۔ لاہور سے دہلی۔ اور دہلی سے لکھنؤ پہونچے۔ وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی تو پونہ کا رُخ کیا۔ پونا سے جی اکتا یا تو بمبئی چلے آئے۔ مقبرہ بمبئی ہی میں بنا۔ حالانکہ خیال کو لمبو میں بنوانے کا تھا۔ ساری عمر اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ کسی نہ کسی طرح ادب کو گھسیٹ کر پراپیگنڈے کے قریب لے آئیں اور آخری عمر میں اس سعی میں کامیاب ہو گئے۔ درجنوں افسانے لکھے۔ لیکن ناول ایک سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ شاعر اور خوش نویس ہونے کے علاوہ کبھی کچھ تھے۔ چندر نئے الفاظ اردو زبان کو عطا فرمائے۔ جن میں سے ایک "قوس قزحی" اور دوسرا "جھٹپٹی" ہے۔

سعادت حسن منٹو:۔

پیلی رنگت۔ کھلی پیشانی۔ خوبصورت بال۔ ڈراؤنی آنکھیں سعادت حسن منٹو کو دیکھکر یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یرقان میں مبتلا ہیں یا ہونے والے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے بعد سب سے بڑے رند اور محمود غزنوی کے بعد شاید سب سے بڑے بت شکن تھے۔ کئی بار حکومت وقت نے گڑگڑا کر التجا کی کہ بت شکنی چھوڑ دو اور منہ مانگا انعام پاؤ لیکن یہ باز نہ آئے۔ قلم برداشتہ لکھتے تھے

اور جب ہاتھوں میں قلم اٹھانے کی سکت نہ رہی تھی۔ تو لکھنا بند کر دیا تھا۔ جوان تو شاید کسی عمر میں بھی نہ تھے لیکن توبہ توڑتے وقت ان کے چہرے پر عجیب قسم کی رونق ضرور دیکھی جاتی تھی۔ ہر قسم کے حجاب سے (سوائے حجاب امتیاز علی کے) شدید نفرت تھی۔ ان کی زندگی کا سانحہ عظیم پیدا ہونا نہیں بلکہ غلط وقت پر پیدا ہو جاتا تھا۔

"ترقی پسند" کی ترکیب سے چڑ تھی۔ لیکن کافی حد تک ترقی پسند تھے۔ تمام عمر ایک ناول لکھنے کا عزم کرتے رہے جس کا صرف سر ورق آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد چھپ سکا۔

شفیق الرحمن:-

مزاح نگار تھے۔ پیروڈی لکھنے میں کمال حاصل تھا لیکن لطیفے جمع کرنے کے شوق نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ آخری تصانیف میں لطائف کی وہ بھر مار ہے کہ اگر انھیں نکال دیا جائے۔ تو شاید باقی کچھ بھی نہ رہ جائے۔ بلا کے حسین تھے اور ہر نئی فوٹو میں پہلے کی نسبت زیادہ خوبصورت نظر آتے تھے۔ طبقۂ اناث میں بیحد مقبول تھے "شیطان" اور "بڈھی" دو کردار اردو مزاح کو بخشے۔ اس کے بعد کردار نگاری سے کچھ اس طرح آنکھیں چرائیں کہ اغیار تو اغیار اپنے بھی انھیں پا گئے۔

احتشام حسین :۔

نقاد تھے، یا ہو سکتے تھے۔خشک ترین تنقید لکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔طویل مضامین لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔رنگینی سے اس قدر نفرت تھی کہ اگر اتفاق سے ایک آدھ خوبصورت فقرہ لکھ جاتے تو اسے فوراً کاٹ دیتے تھے۔زبان پر کافی عبور تھا۔ خیالات کا ہمیشہ فقدان رہا۔

ان کی تنقید ایک ہی نکتے کے گرد گھومنے کے بعد وہاں پہنچ جاتی تھی جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ بہترین ناصح تھے لیکن آخری عمر تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

کنہیا لال کپور :۔

طنز نگار تھے، یا کم از کم سمجھتے تھے کہ طنز نگار ہیں۔ آپ کی ذات صنفِ طنز پر سب سے بڑی طنز تھی۔صرف ایک کام کا مضمون لکھا جو "غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" کے عنوان سے مشہور ہوا بقول اعجاز بٹالوی ان کا پیشہ اوائل عمر میں پگڑی اچھالنا' اور وقت پیری میں پگڑی بندھوانا تھا۔

پاکستان سے بھاگنے کے بعد فیروزپور کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد میں پناہ لی اور آخری عمر میں مسلمان ہونے پر اظہار تاسف کرتے رہے۔ صحیح زبان لکھنے کی کئی بار کوشش کی۔لیکن کامیاب نہ ہو سکے عالم شباب میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ قبر میں سے دو چار

دفعہ اٹھنے کی سعی کی لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مقبرہ موگا میں بنا۔ لوحِ تربت پر یہ شعر کندہ ہے۔

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

راوی :۔ سبحان اللہ اردو ادب کا آخری دور ختم ہوا متقدمین۔ متوسطین۔ متاخرین سب رخصت ہوئے۔ بوم وہما اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹے۔ قصرِ ادب میں سناٹا چھایا ہوا ہے الو تک کی چیخ سنائی نہیں دیتی۔ ہو کا عالم ہے اور قصرِ ادب کے ایک تاریک کونے میں۔ بیچارہ تذکرہ نویس خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ اردو ادب کا آخری دور، اردو زبان کے حق میں سب سے بڑی رحمت ثابت ہو۔

"......گھر یاد آیا!"

بمبئی پہونچ کر بھی یقین نہ آیا کہ ہم بمبئی پہونچ گئے ہیں۔ کیونکہ عرف عام میں جسے بمبئی کہتے ہیں۔ وہ دراصل ایک نہیں بلکہ کئی بمبیئوں پر مشتمل ہے مثلاً ایک بمبئی تو وہ ہے جسے "اندھیری" کہتے ہیں (خدا کا شکر ہے اندھیر نگری نہیں کہتے) اور جسے صرف اس رعایت سے بمبئی کہا جا سکتا ہے جس رعایت سے کسی جرّاح کو سرجن یا غازی آباد کو دہلی کہا جا سکتا ہے۔ ایک بمبئی "بوری ولی" ہے جہاں کروڑوں مچھروں پسوؤں اور مکھیوں نے ہزاروں غریب مزدوروں اور کلرکوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ ایک بمبئی "چنچو کلی" ہے جو بادی النظر میں واقعی "انار کلی" کی خالہ زاد بہن معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انار کلی سے اتنی مختلف ہے جتنی ایک عام لونڈی انار کلی سے تھی۔ ایک بمبئی "باندرا" ہے جسے دیکھنے کے بعد بمبئی کارپوریشن کے وجود سے منکر ہونا پڑتا ہے۔ ایک بمبئی "دادر" ہے جسے دیکھے بغیر شاید غالب نے کہا تھا ؎

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

ان چھوٹی بڑی بمبیئوں کی بھول بھلیاں میں بیچاری اصلی بمبئی اس طرح گم ہو کر رہ گئی ہے جیسے دور از کار استعارے میں مفہوم عنقا ہو کر رہ جائے سو میں سے اسّی آدمی تو اس کی زیارت ہی سے محروم رہتے ہیں اور باقی بیس جب اس کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انھیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ اس کا نام بمبئی نہیں بلکہ بقول مہرا جی "ممُبئی" ہے کیونکہ جس دیوی کے نام پر شہر آباد ہوا تھا، اس کا نام "ممبا دیوی" تھا۔

بمبئی ہندوستان میں واحد شہر ہے جہاں کوئی شخص کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اگر آپ لکھ پتی ہیں تو ہماری بلا سے۔ بمبئی میں کون لکھ پتی نہیں۔ اگر آپ بھوک سے مر رہے ہیں تو شوق سے مریے۔ موت آپ کا پیدائشی حق ہے۔ بہرحال یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم دخل دینے والے کون؟ اگر آپ راستے سے بھٹک گئے ہیں تو سارا دن گلیوں اور بازاروں کے چکر کاٹیے۔ راہگیروں کو اتنی فرصت نہیں کہ آپ کی رہنمائی کر سکیں۔ اگر آپ حاجتمند ہیں تو کسی دوسرے شہر میں تشریف لے جائیے بمبئی والے کہتے ہیں "کس کی حاجت روا کرے کوئی"۔ اس شہر میں کوئی خوبی ہے تو یہ کہ یہاں آپ کی اُن لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جنھیں آپ مدت سے "مرحوم و مغفور" سمجھے بیٹھے تھے۔ آپ کے وہ ہم جماعت جو کالج سے بھاگ گئے تھے، وہ واقف کار جن کے متعلق آپ نے سنا تھا کہ انھوں نے خودکشی کر لی اور آپ کے وہ رشتہ دار جو آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتے

بمبئی کے کسی قہوہ خانے میں آپ سے ضرور ملیں گے اور اگر موقع محل مناسب ہوا تو آپ سے کسی اصلی یا فرضی قرض کا مطالبہ بھی کریں گے۔

اہل بمبئی کے ویسے تو ہزاروں خصوصیات ہیں لیکن سب سے نمایاں ان کی سنجیدگی اور خاموشی ہے۔ قریب قریب ہر شخص سڑک پر چلتے ہوئے اس قدر زبوں حال نظر آتا ہے۔ گویا ابھی ابھی جنازے کو کندھا دے کر آ رہا ہے اور بعض کی آشفتہ حالی کا تو یہ عالم ہے کہ بے اختیار "اِنَّا للہ و انّا الیہ راجعون" پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خدا جانے یہ سمندر کی قربت کا اثر ہے۔ یا بزنس میں رچی ہوئی تاجرانہ ذہنیت کا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اہل بمبئی کے گھر کی رونق "نغمۂ شادی" کی بجائے نوحۂ غم پر موقوف ہے۔ ایک مہینے کے قیام میں میں نے صرف ایک شخص کو قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص پاگل تھا۔

جس طرح لکھنؤ میں ہر شخص "نواب" دہلی میں مغل یا پٹھان اور کلکتے میں "دادا" ہوتا ہے اسی طرح بمبئی میں ہر شخص سیٹھ ہوتا ہے نادار پان فروش سے کروڑ پتی پارسی یا باٹک ہر ایک آدمی سیٹھ کہلاتا ہے۔ بمبئی میں ہزاروں سیٹھ ایسے بھی ہیں جو رات کے وقت سڑکوں کی پٹریوں پر سوتے ہیں اور بیمار ہونے کے بعد خیراتی شفاخانوں میں مرتے ہیں۔ بمبئی کے سیٹھوں کی پہچان یہ ہے کہ انگلی میں ایک آدھ انگوٹھی ضرور ہوتی ہے۔ امارت کا دوسرا امتیازی نشان آٹھ منزلہ عمارت کی ملکیت ہے۔ بمبئی کے سیٹھ عموماً عمارتیں کرائے پر دینے کے لئے بناتے ہیں

اور غیر داجبی کرائے وصول کرنے کے بعد ہر سال عمارتوں کی تعداد میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر عمارت پر متعدد سیڑھیاں ہوتی ہیں جن کی تعداد کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آٹھویں منزل تک پہنچتے پہنچتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے۔

بمبئی کے صورت کدہ میں مردانہ اور زنانہ حسن میں غضب کا تضاد ہے۔ تھوڑے سے مبالغہ سے کام لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بمبئی میں کوئی مرد حسین اور کوئی عورت بدصورت نہیں۔ سمندر اور نگار خانوں کے بعد اس شہر میں تیسری جاذب نظر چیز "صنف نازک" ہے اُجلے چہرے۔ خوبصورت جوڑے۔ شلوار اور ساڑھی کے بَنِ بَنِ قسم کی پوشاک۔ بمبئی کا ہر بُت بتِ سیمیں اور ہر شاہد شاہدِ رعنا ہے جسے دیکھ کر دماغ میں بجلی کے کوندے۔ شعلۂ گل اور تیغ بے نیام کا تصور آتا ہے۔ اس کا حریف نہ بنگال میں ہے اور نہ پنجاب میں جسم اتنا ہلکا پھلکا جیسے جربی چھو تک نہیں گئی۔ اور نین نقش اتنے تیکھے کہ دیکھتے ہی تیر کی طرح دل و جگر میں پیوست ہو جائیں۔ بمبئی کی دوشیزاؤں کو رنگ اور خوشبو سے خاص عقیدت ہے "جوہو" اور انڈیا گیٹ پر شام کے وقت کا رواں رنگ و بو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قدم قدم پر جلوہ گاہ اور چپے چپے پر منزل ہے۔

اہل بمبئی فنونِ لطیفہ کے دلدادہ ہیں۔ خاص کر موسیقی پر تو جان چھڑکتے ہیں۔ عوام و خواص کا رجحان پکے گانے کی طرف ہے چنانچہ

اس گئے گذرے زمانے میں بھی بمبئی میں ایسے اہل کمال موجود ہیں، جو اگرچہ بھیروں گاتے ہیں لیکن یہ راز کھلنے نہیں دیتے کہ وہ کیا گا رہے ہیں۔ بمبئی والے انھیں نہایت شوق اور انہماک سے سنتے ہیں۔ گانے والا چاہے گاتے گاتے اکتا جائے۔ سامعین ڈٹ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محفل رقص و سرود، ایک دفعہ گرم ہونے کے بعد سرد ہونے کا نام نہیں لیتی۔ حتیٰ کہ اہل بمبئی کی قوت استقلال پر انسان کو رشک آنے لگتا ہے

بمبئی میں عجیب وغریب اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک اصطلاح "پگڑی" ہے۔ بظاہر یہ بے ضرر سی ہے لیکن خدانخواستہ اگر اس کا پھندا پڑجائے تو بات دار ورسن تک جا پہنچتی ہے۔ اس شہر میں آپ پگڑی دیئے بغیر کوئی مکان کرایے پہلے ہی نہیں سکتے پگڑی اس ناچیز ہدیہ کا نام ہے جو ایک ضرورتمند آدمی کا مکان خالی کرنے والے شخص کی خدمت میں بصد عجز و نیاز پیش کرتا ہے۔ پگڑی دو ہزار سے دس ہزار تک ہوسکتی ہے۔ اور اگر مکان "مالابار ہل" پر یا "میرین ڈرائیو" پر واقع ہو تو اتنی ہوسکتی ہے کہ آپ اس رقم سے کسی دوسرے شہر میں اچھی خاصی کوٹھی خرید سکتے ہیں۔ ایک اور اصطلاح "بھیل پوری" ہے کہ جو دراصل چاٹ کی مترادف ہے۔ بھیل پوری میں لال مرچ اور گرم مصالحہ اس مقدار میں ملایا جاتا ہے۔ کہ کھانے والا دہلی کی "نہاری" یاد کر اٹھتا ہے۔ بایں ہمہ اس چیز کی مقبولیت کا یہ

یہ حال ہے کہ بمبئی میں بھُنی ہوئی مونگ پھلی کے بعد سب سے زیادہ کھپت اس کی ہے۔

دراصل بمبئی ایک شہر نہیں بلکہ ایک بہت بڑا مقناطیس ہے جو ان دنوں ہندوستان کے اہل فن کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے

چنانچہ کلکتے کی بہترین طوائفیں۔ پنجاب اور یو۔پی سے جلیل القدر ادبا اور شعرا۔ پشاور کے مایۂ ناز ڈوم اور ڈومنیاں مدراس اور آسام کی حسین رقاصائیں آج کل بمبئی میں جمع ہیں ان سب کا حشر کیا ہوگا ؟ اس سوال کا جواب تو مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ البتہ فی الحال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ سحر بنگالہ عرف چلتا جادو جو کبھی کلکتے میں ہوتا تھا آج بمبئی میں ہے۔

بمبئی کے سحر سے چھٹکارا پانا اتنا آسان نہیں جتنا کسی قرض خواہ سے گلو خلاصی کرانا اور یہاں کے "سیٹھوں" کے مقبرے چاہے سطح آب پر بنیں یا وقت کی چٹان پر۔ بنیں گے صرف بمبئی میں!

بمبئی واقعی عجیب شہر ہے۔ سربفلک عمارتیں۔ پٹڑیوں پر سوئی ہوئی مخلوق! کپڑے کے شاندار کارخانے۔ ننگ دھڑنگ مزدور! میلوں تک پھیلا ہوا سمندر۔ غسلخانوں میں بند پانی کے نل! انسانوں کا عظیم اجتماع۔ قبرستان کی سی

بوجھل اور گہری افسردگی ۔ اور بسا اوقات یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے انسان جنّت کی روش پہ ٹہلتے ٹہلتے یک لخت جہنّم میں پہونچ جائے ۔ ایک ایسا جہنّم جہاں ہر سرمایہ دار نے سیم و زر کے عوض اپنی روح کو ابلیس کے سپرد کر دیا ہے اور جس کے شعلے اس تیزی اور تندی سے بھڑک رہے ہیں کہ دوزخ پر چراغاں کا گماں ہوتا ہے ۔

....خواب ہے دیوانے کا

اس وقت رات کے دو بجے ہیں اور میں دیئے کی مدھم روشنی میں انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے کلام پر شرح لکھ رہا ہوں۔ ورڈزورتھ "قدرت" کا پجاری تھا۔ عظیم فنکار تھا۔ انگلستان کا سب سے بڑا "مغنی تھا" نرا چغد تھا۔ کتنی مشکل نظمیں لکھ گیا ہے۔ تین بار پڑھو پھر بھی مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اور پھر لے دے کے ہر نظم میں وہی بات "قدرت کی پرستش کرو۔ کھلی فضا میں گھومو۔ چشمے، وادیاں، پہاڑ تمھیں پکار رہے ہیں۔" پکار رہے ہیں تو پکارتے رہیں۔ یہاں فکرِ معاش سے فرصت کسے ہے کہ ان کی پکار سن سکے۔ اور پھر کھلی فضا ہے کہاں؟ میلوں تک بازار، گلیاں، کارخانے۔ گرد اور دھواں۔ تاریکی اور تعفن.......... نہیں نہیں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ تو اس نے اچھا کیا کہ مشکل اور طویل نظمیں لکھیں ورنہ ان پر شرح کون لکھواتا۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ ان پر غلط سلط شرح لکھ کر ناشر سے کافی روپیہ اینٹھا جا سکتا ہے۔ یہ ناشر بھی بڑے خبیث ہوتے ہیں۔ معاہدہ کرتے وقت

کتنے سبز باغ دکھاتے ہیں۔ اور کتاب چھپ جائے تو پھوٹی کوڑی نہیں دیتے۔ خیر! اس دفعہ میں کوڑی کوڑی وصول کروں گا "ایک روپیہ فی صفحہ" کوئی خاص بُرا سودا نہیں، اگر دس صفحے روزانہ لکھوں تو دس روپے روزانہ کما سکتا ہوں۔ لیکن لکھنے کون دیتا ہے۔ یہ بچے بھی عجیب نٹ کھٹ واقع ہوئے ہیں۔ جوں ہی لکھنے بیٹھتا ہوں، شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر ان کے تقاضے "بابوجی! ہم آئس کریم کھائیں گے۔ ہم ربڑ کا چھالو لیں گے۔ ہم گھومنے چلیں گے" غنیمت ہے کہ اس وقت سو رہے ہیں۔ کتنے مزے سے خراٹے لے رہے ہیں۔ اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ پاس بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ اور اُنھیں زور زور سے خراٹے نہیں لینے چاہئیں۔ ان کی ماں بھی اُنھیں نہیں سمجھاتی۔ وہ بیچاری بھی مجبور ہے۔ سارا دن کام کرکے تھک جاتی ہے۔ اس طرح سو رہی ہے جیسے کسی نے کلوروفارم سونگھا دیا ہو۔ اچھا انھیں سونے دو۔ آج میں دس صفحے لکھ کر آرام کروں گا۔ مجھے جلدی جلدی کام کرنا چاہیئے۔ آج ناشر کی چھٹی آئی تھی کہ مکمل مسودہ پندرہ تاریخ تک مل جانا چاہیئے۔ پندرہ تاریخ! میں انسان ہوں یا بجلی کی مشین۔ پندرہ تاریخ تک تو آدھی کتاب بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ خیر کوشش تو کرنی چاہیئے۔ بڑی مشکل سے اتنا اچھا ناشر ہاتھ لگا ہے۔ ناراض ہوگیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا ۔۔۔۔۔۔

"ورڈز ورتھ نے جب یہ نظم لکھی۔ وہ اکیس برس کا نوجوان تھا"

اکیس برس کی عمر میں یہ خرافات! معلوم ہوتا ہے اسّی برس کا بوڑھا لکھ رہا ہے۔ عورت۔ شراب۔ کالی گھٹا۔ کسی چیز کا ذکر تک نہیں کرتا۔ ہمارے اُردو شعرا کتنے اچھے ہیں۔ کتنی پیاری پیاری غزلیں لکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں فراقؔ نے کتنی شاندار غزل کہی تھی۔ کیا پھڑکتا ہوا مطلع تھا۔ پھر ذہن سے اتر گیا۔ لیکن کیا مصرعہ کہہ گیا ظالم ؎

"کالی متوالی گھٹا جھوم پڑی اے ساقی"

یہ ورڈز ورتھ ساقی کا کیوں ذکر نہیں کرتا۔ کم بخت نے کسی سے محبت تو ضرور کی ہوگی۔ ایسے بدصورت انسان سے محبت کون کرسکتا تھا جبھی تو بار بار لپک کر قدرت کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔

"ورڈز ورتھ نے اس نظم میں اپنی بہن سے خطاب کیا ہے"۔

لاحول ولا۔ دنیا جہان میں خطاب کرنے کو کوئی عورت نہ ملی تو اپنی بہن بھلا ایک شاعر اپنی بہن سے کیا کہہ سکتا ہے۔ بہن کی بجائے ملازمہ ہوتی تب بھی شاید بات بن جاتی۔

ورڈز ورتھ اپنی بہن سے کہتا ہے" دمکتا ہوا سورج کتنا خوبصورت نظر آتا ہے۔"

کیا دریا فت ہے؟ بھلا یہ کون نہیں جانتا۔ اور کیا اس کی بہن اتنی بے خبر ہے کہ اُسے یہ بتانے کی ضرورت تھی۔

"جب میں چودھویں کے چاند کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر نشے کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے"۔ اُف کتنا خشک مزاج ہے کم بخت

خیال تھا کہ کہے گا " مجھے اپنی محبوبہ کا چہرہ یاد آجاتا ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسی عورت دیکھی ہوتی۔ تو کہتا۔ اس کی زندگی میں تو بیوی اور بہن کے علاوہ تیسری عورت داخل ہی نہیں ہوئی۔ خیر مجھے اس سے غرض مجھے تو ورق سیاہ کرنے ہیں جتنے زیادہ صفحے لکھوں گا اتنے روپئے ناشر سے وصول کرلونگا۔ اگر اشعار بے معنی اور بے جان ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

"جو شخص قدرت سے محبت نہیں کرتا اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں "

یہ بھی خوب کہی! ایمان کی تو یہ ہے کہ جو شخص ایسی بے رس نظم لکھے۔ اُسے گولی سے اُڑادینا چاہیئے ....

"تڑاخ! تڑاخ! تڑاخ! ہیں۔ یہ گولی کہاں چل رہی ہے؟ کسی کیمپ پر حملہ ہوا ہے۔ مارو! مارو! بچاؤ! بچاؤ!..... مجھے مت پکڑو۔ میں کنواری ہوں .... ہاہاہا۔ ہم تم سے شادی کریں گے۔ فکر نہ کرو....... میرے سہاگ پر رحم کرو... میں بیاہتا ہوں..... اری چل بیاہتا کی بچی۔ تجھے خاوند ہی چاہیئے نا؟..... اوئی ماں...... میری بچی ..... پکڑو .... پکڑو۔"

....

"جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسان نے انسان پر کتنا ظلم کیا ہے تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔"

شکر ہے ۔ کم بخت نے ایک بات تو کام کی کہی " میں کانپ اٹھتا ہوں "کیا بات ہے ورڈز ورتھ کی " میں کانپ اٹھتا ہوں "......
"آپ کانپ کیوں رہے ہیں؟ سردی لگ رہی ہے کیا؟ کمبل اڑھا دوں؟
"کون؟ رکمن؟ تم اور اس وقت؟"
"میں وہاں سے آئی ہوں"
"وہاں سے کہاں سے؟"
"وہ مجھے پکڑ لے گئے تھے ۔ میرے خاوند کو گولی مار دی تھی"
"پکڑ لے گئے تھے اور پھر چھوڑ دیا؟"
"ہاں"
"بڑے بد مذاق ہیں"
"نہیں انھوں نے مجھے بالکل [illegible]
[illegible]
[illegible] کام پہ صرح
لکھ رہا [illegible]
"یہ [illegible] اور وقت بھی ہو سکتا ہے"
"مجھے پندرہ تاریخ تک ناشر کو مکمل مسودہ دینا ہے ۔"
"ناشر بھاڑ میں جائے ۔ لاؤ یہ ورق"
"خدا کے لئے اسے پھاڑنا مت ۔ بڑی مشکل سے آدھا صفحہ

لکھا ہے ۔ آدھا صفحہ ! آٹھ آنے ! "

" تم تو بالکل بنیوں کی سی باتیں کرتے ہو ۔ اچھا میں جاتی ہوں "

" نہیں نہیں ٹھہرو ۔"

" ٹھہر کر کیا کروں گی ؟ تم مصروف ہو "

" اچھا ! تم ناراض ہوتی ہو ۔ لو اب میں نہیں لکھوں گا ۔"

" کوئی بات کرو ۔ تم تو بالکل چپ ہو گئے ۔"

" ورڈز ورتھ قدرت کا پجاری تھا ۔"

" جہنم میں جائے ورڈز ورتھ ۔ کیا میں اتنی دور سے یہ بکواس سننے کے لئے آئی ہوں ۔"

" اچھا ! تو تم کوئی بات کرو ۔"

" کیا تمہیں اس کمرے میں بیٹھے ہوئے گھٹن محسوس نہیں ہوتی ؟ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ۔ یاد ہے ؟ تم کہا کرتے تھے زندگی چاندنی رات ہے ۔"

" جھوٹ ۔ زندگی اماوس کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے ۔"

" یاد ہے وہ چشمہ جس پر ہم دونوں چوری چھپے ملا کرتے تھے اور نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کیا کرتے تھے ۔"

" وہ چشمہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا ہے ۔"

" میں وحشی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی تھی ، اور تم میرا تعاقب کیا کرتے تھے ۔ حتیٰ کہ میری سانس پھول جاتی اور تم مجھے اپنے

مضبوط بازوؤں میں ...."

"آہستہ بولو۔ میری بیوی پاس ہی سو رہی ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اس سے پہلے تمہاری زندگی میں داخل ہوئی۔ میرا حق اس سے کہیں زیادہ ہے..... ہاں تو یاد ہے وہ رات جب تم نے میرے سر کی قسم کھا کر کہا تھا کہ تم......"

"پرماتما کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ اگر اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے سن لیا تو...."

"تو کیا ہوگا؟"

"میرا مطلب ہے وہ کیا کہے گی۔"

"وہ کہے گی تم بڑے ذلیل ہو۔"

....

....

....

"تم واقعی بڑے ذلیل ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت بھی یہ گھٹیا قسم کی سطریں لکھ رہے ہو گے۔"

"ہیلو کرشن! کہو بھئی تم کب آئے؟"

"ابھی۔ کیا تم نے میری کار کے بھونپو کی آواز نہیں سنی؟"

"میں دراصل مصروف تھا۔ ایک لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔"

"کون لڑکی؟"

"دشمن ۔ وہ مجھے ملنے آئی تھی پاکستان سے ۔"

"خواب تو نہیں دیکھ رہے ۔ معلوم ہوتا ہے فضول شعر لکھ لکھ کر تمھارا دماغی توازن قائم نہیں رہا ۔"

"آؤ بیٹھو ۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے ۔"

"فلمی فقرے مت دہراؤ ۔"

"ع بہت دیر کی مہرباں آتے آتے ۔"

"فرسودہ مصرعے مت پڑھو ۔"

"ع بن گیا گھر مرا خیّام کا گھر آج کی رات "

"بکواس بند کرو ...... یہ کیا لکھ رہے ہو ؟"

"درد ٹز ورتھ پر شرح ۔ ایک صفحہ ایک روپیہ"

"عجیب ہونق ہو ۔ تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ یہ فضول باتیں چھوڑ دو ، کوئی کام کی چیز لکھو ۔ ہندوستان کو سستی اور بے ہودہ شعروں کی ضرورت نہیں ہے صحت مند اور جاندار ادب کی ضرورت ہے میکسم گورکی اور ایلیا اہرن برگ کی ضرورت ہے ۔ تم اپنی تخلیقی قوتیں برباد کر رہے ہو ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اگر میں یہ کام چھوڑ دوں تو ...... ؟"

"تو تم بھوکوں مر جاؤ گے ۔ تمھاری بیوی اور بچے بھوکوں مر جائیں گے ۔"

"ہاں "

"اور اب گویا تم زندہ ہو۔ کاش تمھیں احساس ہوتا کہ تم کبھی کے مر چکے ہو۔"

"شاید"

"شاید نہیں یقیناً۔"

"میں بہت جلد شرحیں لکھنا بند کر دوں گا۔"

"آج سے دس سال پہلے تم نے یہی کہا تھا۔"

"یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد نہیں لکھوں گا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ تمھیں فضول کام کرنے کا چسکا لگ گیا ہے۔"

"میں عنقریب اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔"

"تم کبھی نہیں کر سکتے۔ تم یہ کام بدستور کرتے رہو گے حتیٰ کہ لکھتے لکھتے تمھاری کمر دوہری ہو جائے گی۔ اور تم اتنے کریہہ المنظر ہو جاؤ گے کہ تمھیں دیکھ کے ڈر لگے گا۔"

"تم مبالغہ سے کام لے رہے ہو۔"

"اس کا فیصلہ مستقبل قریب کر دے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں دروازہ بند کر لو۔"

....

....

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ

"کون ہے؟"

"رام دھن۔ دروازہ کھولیئے"

"آیئے آیئے۔ آپ اس وقت..."

"میں صبح کی گاڑی سے آرہا ہوں"

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے.... ہاں تو آپ نے ورڈزورتھ پر شرح لکھ لی ہے"

"جی نہیں۔ ہاں۔ کام شروع کر دیا ہے بلکہ آدھا صفحہ تو لکھ بھی لیا ہے۔"

"صرف آدھا صفحہ! آپ نے تو پندرہ تاریخ تک مکمل مسودہ دینے کا وعدہ کیا تھا"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن میں ذرا بیمار میرا مطلب ہے مصروف رہا۔"

"یہ سب بہانے ہیں۔ آپ نے مجھے دھوکا دیا۔ اگر آپ کام ختم نہیں کر سکتے تھے تو آپ کو شروع میں کہہ دینا چاہیئے تھا"

"آپ یوں ہی ناراض ہوتے ہیں۔ آخر اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔؟"

"کیا ضرورت ہے؟ اور وہ جو میرا ہزاروں کا نقصان ہو رہا ہے اس کا کون ذمہ دار ہے؟"

"آپ ایک مہینے کی مہلت دیجیئے۔ میں کام ختم کروں گا۔"

"ایک مہینہ؟ میں ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ آج سے معاہدہ منسوخ سمجھیئے۔"

"ایسا مت کہیئے۔ مجھے ایک موقعہ اور دیجیئے۔"

"ہرگز نہیں۔"

"دیکھیئے میں نے درڈ زورنفر پر اتنا کام کیا ہے وہ بیکار جائے گا"

"خاک کام کیا ہے آپ نے؟ لکھا ہی کیا ہے اب تک۔"

"کم از کم آدھا صفحہ تو لکھا ہے۔"

"میں آدھے صفحے کی اُجرت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"لیکن......."

"لیکن ویکن کچھ نہیں لیجیئے۔"

رام دھن زور سے اٹھنی میرے منہ پر مار دیتا ہے۔ میں درد سے بلبلا اٹھتا ہوں۔ یک لخت نیند سے چونک کر میری بیوی کہتی ہے "اُف کتنا بھیانک خواب تھا" اور میں سرد آہ بھر کر جواب دیتا ہوں "کاشش! یہ سب محض خواب ہوتا"